احتساب زندگی

سورۂ انبیاء کی روشنی میں

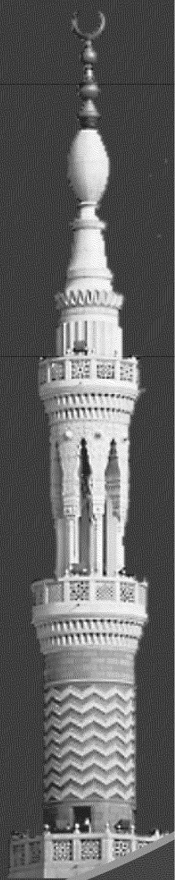

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

احتسابِ زندگی

سورۂ انبیاء کی روشنی میں

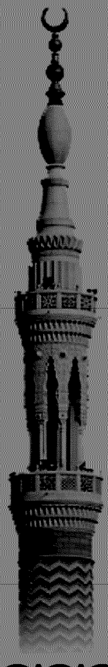

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

مرتب

محمد ارمغان بدایونی ندوی

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول

شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ - مئی ۲۰۱۷ء

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

نام کتاب : احتساب زندگی-سورۂ انبیاء کی روشنی میں

مؤلف : حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

ترتیب : محمد ارمغان بدایونی ندوی

صفحات : ۱۶۸

قیمت : Rs. 120/-

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء،

☆ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

عرض ناشر ۹

انسانی فطرت کا تقاضا

متنوع کیفیات ۱۱
اسلام کا مفہوم ۱۲
خدا کا مطالبہ ۱۴
انسانی فطرت ۱۵
خدائی نظام ۱۶
نظام کائنات ۱۷
نبی اور رسول ۱۸
انبیاء کی قربانی ۱۸
معجزات کا مقصد ۱۹
بت پرستی سے قبل ۲۰
شرک کی ابتداء ۲۲
مشرکین کا حال ۲۵
انتہائی ناپسندیدہ چیز ۲۶
معزز ترین مخلوق ۲۶
خدائی نعمتوں کا تقاضا ۲۸

www.abulhasanalinadw.org

اصل کتاب کا مفہوم ۳۰
عربوں کی خصوصیت ۳۱

احتساب نفس کی دعوت

خدا کی قدرت کاملہ ۳۴
انسان وجن کا اختیار ۳۶
استخلاف فی الارض کا مقصد ۳۶
دنیوی زندگی کی مثال ۳۷
کفار کا استہزاء ۳۹
مشرکین کے دلوں کا قبلہ ۴۰
علم خداوندی ۴۲
اٹکل باتیں ۴۳
قانون الٰہی ۴۴
انبیاء کا تسلسل ۴۵
بشریت انبیاء علیہم السلام ۴۶
وعدہ کا نفاذ ۴۶
آخری آسمانی کتاب ۴۷
ظلم کا انجام ۴۸
خدا کی گرفت کا ڈر ۴۹
انسان کی بے بسی ۵۰
آسمان وزمین کی تخلیق کا مقصد ۵۱
حق وباطل کا فرق ۵۲
خدا کی بزرگی ۵۳
معبودان باطل ۵۴

www.abulhasanalinadw.org

خدا کی وحدانیت ۵۵
ناواقفیت کا نقصان ۵۶
ظالمین کا انجام ۵۸
دعوت فکر ۵۹
علم ہیئت اور اسلام کا نظریہ ۶۰
پانی کی اہمیت ۶۳
پہاڑ ایک نعمت ۶۳
آسمان ایک محفوظ چھت ۶۴
قمری اور شمسی نظام ۶۵
انسانی کمزوری ۶۶
موت وزندگی کا نظام ۶۷
رحمان کے منکر ۶۸
انسانی مزاج ۶۹
عذاب کی تشریح ۷۰
استہزاء کا نتیجہ ۷۱
خدا کا نظام محفاظت ۷۲
فرضی خداؤں کا حال ۷۴
غفلت کا سبب ۷۵
مشرکین کی مثال ۷۷
خدا کی طاقت ۷۸
میزان عدل ۷۹
تاریخ کی ایک زندہ مثال ۸۰
نبی کی بات کی اہمیت ۸۱
مبارک کلام ۸۲

ذکرانبیاء

انبیاء کی ذمہ داری ۸۳
انسانی صلاحیتوں کا منبع ۸۵
دو الٰہی نظام ۸۶
ناشکری کا مفہوم ۸۶
بعثت انبیاء علیہم السلام ۸۷
انبیاء کے واقعات کا مقصد ۸۸
واقعات کے دو رخ ۹۰
انسانی زندگی کی اصلاح کا انحصار ۹۲
مقصد حیات کی اعلیٰ مثال ۹۳
حضرت ابراھیم علیه السلام ۹۵
قرآن مجید کی بلاغت ۹۵
نجومی تحقیقات ۹۷
بت پرستی کی شکلیں ۹۸
صاحب فہم وفراست ۹۹
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت ۱۰۰
توحید سراپا ۱۰۱
جرأت مندانہ اقدام اور نصرت خداوندی ۱۰۲
توحید پر استقامت ۱۰۵
اعلان براہیمی ۱۰۶
خدا کی مدد ۱۰۹
خواص اشیاء کی حقیقت ۱۱۰
اللہ تعالیٰ کی قدرت ۱۱۰

www.abulhasanalinadw.org

مشرک قوم کی سازش.. ۱۱۱
ہجرت کا حکم.. ۱۱۲
حضرت لوط علیہ السلام.. ۱۱۲
مبارک زمین.. ۱۱۳
انعامات الٰہیہ.. ۱۱۳
شرفاء کا خاندان.. ۱۱۳
قصہ ابراہیمی کا پیغام.. ۱۱۴
اگلی بات.. ۱۱۶
حضرت نوح علیہ السلام.. ۱۱۸
نبی کی دعا کے بعد.. ۱۱۹
حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام.. ۱۲۱
قضیہ دربار داؤد میں.. ۱۱۲
فیصلۂ سلیمانی.. ۱۲۳
ضروری وضاحت.. ۱۲۳
خدائی انعامات.. ۱۲۴
زرہ کی تعلیم.. ۱۲۵
تخت سلیمانی.. ۱۲۶
جنات پر حکمرانی.. ۱۲۶
حضرت ایوب علیہ السلام.. ۱۲۷
قدرت الٰہی کے مظاہر.. ۱۲۹
تین صابر انبیاء.. ۱۳۰
حضرت یونس علیہ السلام.. ۱۳۲
حضرت یونس علیہ السلام کی قوم.. ۱۳۴
لمحہ فکریہ.. ۱۳۵

www.abulhasanalinadw.org

حضرت زکریا علیہ السلام............................... ۱۳۶
حضرت مریم علیہا السلام ۱۳۸
متحدہ امت ۱۳۹
فرق کا معیار ۱۴۰

دعوت فکر وعمل

نظام کائنات کی مثال ۱۴۴
انسان اور دیگر مخلوقات میں فرق............................. ۱۴۴
دخول جنت کی شرط.. ۱۴۶
سبب ومسبب کی تشریح ۱۴۶
خدا کا انصاف.. ۱۴۸
انبیاء کی زندگی انسانیت کے لیے نمونہ ۱۴۸
محنت کا صلہ ۱۵۲
مستحق عذاب قومیں ۱۵۳
متقین کا استقبال.. ۱۵۵
متقین پر خدا کے انعامات ۱۵۵
نظام کائنات اور خدا کا برحق وعدہ........................... ۱۵۷
بنی اسرائیل کی گستاخیاں ۱۵۹
خدائی مار... ۱۶۰
انسانی طبیعت کی کمزوری ۱۶۰
طے شدہ بات ۱۶۱
متقین کے لیے پیغام.. ۱۶۲
رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ۱۶۳
خدائے واحد وبرتر... ۱۶۶

www.abulhasanalinadw.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ وہ رمضان المبارک میں اپنے وطن دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں میں قیام فرما ہوتے تھے، اہل تعلق کی خاصی تعداد حضرت کے ساتھ رمضان گذارنے کے لیے جمع ہو جاتی تھی، اس میں درس قرآن، درس حدیث اور متعدد کتابوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اخیر سالوں میں اہل محبت کے اصرار پر حضرت نے خود درس قرآن کا سلسلہ شروع فرمایا جو تقریباً دس سال حضرت کی وفات تک جاری رہا، اس درس میں زیادہ تر حضرت کے خواطر وانطباعات ہوتے تھے اور بعض ایسی نکتے کی باتیں سامنے آتی تھیں جو عام طور پر کتابوں میں بھی نہیں ملتیں، اس میں حضرت کے قرآنی ذوق کا بڑا حصہ تھا، اور عربی زبان وادب کا بھی اس میں دخل تھا، جس کا حضرت کو ذوق ہی نہیں بلکہ ذائقہ تھا، اور یہ ان کو اپنے محبوب استاد شیخ خلیل عرب یمانی سے ورثہ میں ملا تھا۔

حضرت کی وفات کے بعد اہل تعلق کے اصرار پر ان کے جانشین عم مخدوم ومعظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے یہ سلسلہ شروع کیا، اور الحمد للہ ''سورۂ فرقان'' تک کا درس مکمل ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے، اور یہ سلسلہ مکمل فرمائے، الحمد للہ ادھر کئی سالوں سے یہ دروس ریکارڈ ہوتے رہے اور ویب سائٹ پر ڈالے جاتے رہے، دنیا کے مختلف حصوں میں ان سے استفادہ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

حضرت مدظلہ کے ان دروس کی بڑی خصوصیت ان کا آسان اسلوب اور بلیغ انداز بیان ہے، جن میں اہم علمی نکتوں کے ساتھ عوام وخواص کی ذہن سازی اور پیغام قرآن سے ان کو مانوس ومتعارف کرانے کے ساتھ قلب ونظر میں اس کو اتار لینے کی دعوت ہے، جس کو شریک ہونے والا محسوس کرتا ہے، اس کے علاوہ جغرافیہ وتاریخ سے مولانا کا خاص شغف فہم قرآن کے دروازے کھولتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں موضوعات فہم قرآن کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ دروس بڑی اہمیت کے حامل ہیں، عرصہ سے تقاضا تھا کہ ان کو قلم بند کیا جائے، بڑی مسرت کی بات ہے کہ عزیز القدر مولوی محمد ارمغان ندوی سلمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت بخشی، انھوں نے یہ سلسلہ شروع کیا، سردست ایک ایک سورہ کا درس مرتب کر کے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس سے پہلے سورۂ حجرات کا درس ''اسلامی معاشرہ'' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا، سورۂ یوسف کا درس خود حضرت ملاحظہ فرما رہے ہیں، یہ سورۂ انبیاء کا درس ہے، جس کو پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، مضمون کی مناسبت سے ''احتساب زندگی'' کے نام سے یہ ناظرین کے سامنے ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ عزیزی ارمغان سلمہ کے ضبط تحریر میں لانے اور ترتیب کے بعد اس گنہگار نے اس پر ایک نظر ڈالی، حضرت کی مشغولیت کی بنا پر وہ ان کے حوالہ نہیں کیا جا سکا، اس لیے اگر ترتیب میں کوئی سقم نظر آئے تو وہ اس راقم آثم کی کمزوری ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور حضرت مولانا کے لیے، مرتب کے لیے اور تمام شریک ہونے والوں کے لیے صدقہ جاریہ فرمائے۔ آمین.

بلال عبدالحی حسنی ندوی

www.abulhasanalinadw.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانی فطرت کا تقاضا

متنوع کیفیات

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے اور انسان کی فطرت بہت ہی متنوع قسم کے پہلو رکھتی ہے، انسان میں بہت متنوع قسم کی کیفیات ہوتی ہیں، خود انسان کے اندر تنہا جو کیفیات ہیں وہ بھی بہت متنوع اور بہت گہری ہیں، اور بعض مرتبہ بالکل کھلی اور نمایاں ہوتی ہیں، جیسے: غصہ ہے وہ انسان کی کھلی ہوئی خصوصیت ہے، اس کو جو بات غصہ دلائے اس سے اس کو غصہ آتا ہے، اسی طرح رنج والی بات بھی انسان کی خصوصیت ہے، کوئی تکلیف دہ بات ہو تو انسان کو رنج ہوتا ہے، تو یہ انسان کی موٹی موٹی خصوصیات ہیں، لیکن باریک خصوصیات بھی ہوتی ہیں کہ کوئی بات سن کر انسان کی طبیعت بدمزا ہو جائے، یا کوئی بات سن کر طبیعت میں ایک انشراح پیدا ہو جائے، کوئی بات سن کر آدمی کو اندر سے یہ محسوس ہو کہ یہ بات تو ٹھیک کہہ رہے ہیں، سچی بات کہہ رہے ہیں، ہم اس کا کیسے انکار کریں، آدمی میں ایک صفت جو تکبر کی ہے، یعنی یہ کہ ہم اپنے برابر والے کی بات کیسے مان لیں، وہ تو بڑا ثابت ہو جائے گا، اس میں ہماری توہین ہے، بعض وقت آدمی اس لیے بھی بات نہیں مانتا کہ دوسرا بڑا ثابت ہو جائے گا، درحقیقت یہ انسان کے اندر کا ایک جذبہ ہوتا ہے، اور بعض وقت بات کو اس لیے نہیں مانتا کہ اس کے دماغ میں ٹھیک سے نہیں اترتی، یا اس کے دل میں ٹھیک سے نہیں اترتی، کیونکہ دماغ و دل دونوں

www.abulhasanalinadw.org

کا میدان الگ ہے، دماغ کا میدان اسباب کے لحاظ سے چلتا ہے، اور دل کا مزاج ہے کہ وہ اسباب پر نہیں چلتا ہے، بلکہ اس کا دارومدار اندر کے احساس پر ہے، بعضوں کو وہ احساس بالکل عقل وذہن کے خلاف ہوتا ہے، یعنی آدمی سمجھتا ہے کہ اس میں نقصان ہے، لیکن جی اس کا اسی چیز کو چاہ رہا ہے، حالانکہ سمجھ رہا ہے کہ اس میں نقصان ہے لیکن دل نہیں مانتا، یا یہ کہ دل نہیں چاہ رہا ہے لیکن چیز فائدہ کی ہے، اور چونکہ دل نہیں چاہ رہا ہے، اس لیے آدمی اس کو کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اسلام کا مفہوم

اسلام کے معنی ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کے حوالہ کردے، اس کا یہ حال ہوجائے کہ جو اللہ چاہتا ہے ہم وہی چاہتے ہیں، ہم غلام سے بھی کمتر ہیں، اس کو تو آقا نے پیدا نہیں کیا بلکہ خریدا ہے، لیکن انسان کو اور تمام ذی حیات کو سب کو اللہ نے بنایا ہے، باقاعدہ ہر ایک چیز اس کی بنائی ہوئی ہے، اور ہر ایک اسی کے تابع ہے، تو جس طرح انسان کسی چیز کو بناتا ہے تو اس کو اس پر پورا اختیار ہوتا ہے، چاہے تو اس کو توڑ دے، چاہے تو اس کو باقی رکھے، اس سے کوئی اعتراض نہیں کرسکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ جو بھی معاملہ کرے اس کو اس کا پورا حق ہے، اس نے انسان کو عدم سے وجود عطا کیا، اس نے ایسی ایسی خصوصیات وصفات رکھی ہیں جو اس کو کامیاب زندگی میں معاون ہوں، اور اس کے مقاصد کو پورا کریں، اس کی زندگی کو خوشگوار بنائیں، اور اس کے بعد اس میں دل ودماغ بھی رکھا کہ جو دماغ حساب لگا کر چلتا ہے، اور دل اپنی پسند پر چلتا ہے، چنانچہ ان سب چیزوں سے نوازنے کے بعد اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تم کم از کم شکرگذار بن جاؤ، کیونکہ ہم ہی نے تم کو یہ نعمتیں دی ہیں، تمہیں یہ سارے وسائل دیئے ہیں، کیا کھانا تم نے خود پیدا کیا ہے؟ نہیں، اگر دیکھا جائے تو ہماری کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہم نے خود بنائی ہو، ہم غور نہیں کرتے ہیں لیکن بات یہی ہے، آپ کوئی بھی چیز لے لیں، اس کی تاریخ دیکھیں، تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ یہ سب اللہ کا فضل ہے، مثلاً:

آپ کپڑے پہنے بیٹھے ہیں، آپ کہیں کہ یہ ہمارا ہے، یہ ہم نے سلوایا ہے، بنوایا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ آپ کا کیسے ہوا؟ کیا اس کو آپ نے بنایا؟ نہیں، بلکہ پہلے سوت کسی شخص نے بنایا، پھر جس نے سوت بنایا وہ بھی کس چیز سے بنایا؟ ظاہر ہے وہ اللہ کی دی ہوئی چیز سے بنایا، اصلاً اس نے بھی نہیں بنایا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز ہی سے اس نے سوت بنایا، پھر اس سوت سے کپڑا کسی اور شخص نے بنایا، اور پھر کپڑے کو بازار میں کسی دوسرے شخص نے پہنچایا، اور پھر اس کے بعد بازار میں خریدنے والا کوئی اور شخص ہے، پھر آپ نے وہ کپڑا درزی کو دیا اس نے اس سے کرتا بنایا، تب جا کر وہ کرتا آپ کو ملا، تو اس میں جو ہاتھ لگے ہیں، اگر ان میں سے کسی ایک چیز کو حذف کر دیں تو کرتا نہ ملتا تو سوت نہ بنایا جاتا، یا کپڑے کو بازار میں نہ لایا جاتا، یا درزی اس کو نہ سیتا، غرض کہ کسی بھی ایک چیز کو ہٹا دیں تو کرتا نہ ملتا، مگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ کرتا ہمارا ہے، ہم نے حاصل کیا ہے، حالانکہ دس بارہ آدمیوں کا ہاتھ اس میں لگا ہے، تب آپ کو کرتا ملا ہے، اگر ان میں سے ایک آدمی کا ہاتھ بھی ہٹ جائے تو کرتا آپ کو نہیں مل سکتا تھا۔

اسی طرح کوئی بھی استعمال کی چیز لے لیں جن سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں، یہی معلوم ہوگا کہ یہ سب ہم کو دوسروں کے احسان و تعاون سے ملی ہیں، اور دوسروں کا تعاون بھی اصل نہیں ہے، کیونکہ اگر اصل وہ چیز ہی نہ ہوتی جس سے چیزیں بنائی گئی ہیں تو یہ کچھ نہ ہوتا، کائنات کا سارا نظام اسی طرح چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین اور فضا میں وہ ساری چیزیں رکھ دی ہیں جس کی ہم کو ضرورت ہے، جس سے ہم اپنی ضرورت کی چیزیں بنا سکتے ہیں، ہماری زندگی کی ضروریات جن چیزوں سے پوری ہوتی ہیں، وہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مہیا کر دی ہیں، چنانچہ ہم انہیں کو جوڑ جاڑ کر اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں، اس لیے ہمارا حبہ حبہ، بال بال یہ اللہ تعالیٰ کے کرم ہی سے ہم کو ملا ہے، لہٰذا ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم کم از کم اس بات کا اعتراف کریں، اس کو مانیں کہ یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم

www.abulhasanalinadw.org

کو یہ چیزیں دیں، ورنہ ہم کو کہاں ملتیں، آج کل ہم ہر چیز کو جو اپنا کہتے ہیں، یہیں سے ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے، ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ اگر ہم دوسرے کا احسان مانتے ہیں تو اس حد تک مانتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کو نظر انداز کردیتے ہیں، اور اس شخص کو اصل سمجھ لیتے ہیں، جو بات اللہ کے کرنے سے ہوتی ہے وہ ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرا بھی کرسکتا ہے، درحقیقت یہیں سے شرک شروع ہوجاتا ہے کہ ہم دوسرے کو شریک کردیتے ہیں، اور اس کو نظر انداز کردیتے ہیں جس سے سب کچھ ملا ہے اور سب کچھ اسی کے کرم سے ہے، اگر کسی ایک چیز کو وہ ہٹا لے تو بات ختم، مثلاً: اگر اللہ تعالیٰ سورج کی گرمی کو بڑھا دے تو یہ ساری آبادی ختم ہوجائے گی، کیونکہ یہ جس اعتدال پر چل رہی ہے وہ اعتدال مفقود ہوجائے گا، اس وقت جو لوگ زندہ ہیں یہ فضا کے اعتدال پر چل رہے ہیں، سورج کی جتنی گرمی ہمارے لیے ضروری ہے، اتنی گرمی اللہ تعالیٰ نے سورج میں رکھی، اور اس کا ایسا فاصلہ رکھا ہے کہ ہم کو گرمی اتنی ہی پہنچے جتنی ہمیں ضرورت ہے، اگر گرمی بڑھ جائے تو مشکل، گھٹ جائے تو مشکل، اسی طرح ہوا کا معاملہ ہے، اگر ہوا نہ چلے تو مشکل، بہت تیز چلے تو مشکل، غرض کہ اللہ تعالیٰ نے سارے نظام میں جو توازن رکھا ہے اور جس توازن کے ساتھ ہر چیز کو انجام دیا ہے، اگر ذرا بھی اس میں اللہ تعالیٰ فرق کردے تو انسان بے بس ہے، وہ کچھ نہیں کرسکتا، اسی طرح دواؤں اور سارے وسائل کا حال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت اور اسی کے حکم کے تابع ہیں۔

خدا کا مطالبہ

اللہ تعالیٰ انسانوں سے کہتا ہے کہ ہم نے تم کو پیدا کیا، لہٰذا کم سے کم تم اس بات کو مانو کہ یہ تمام چیزیں ہم نے تم کو دیں، اور ان چیزوں میں جو خصوصیات رکھیں، وہ بھی تمہاری زندگی اور صحت کے لیے رکھیں، لہٰذا اس حقیقت کو مانو، یہ سمجھو کہ دواؤں میں تاثیر کہاں سے آئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ ان اشیاء میں وہ خصوصیت نہ رکھتا، جن کی بنیاد پر

یہ اپنا کام کرتی ہیں، تو تم کچھ نہیں کر سکتے تھے، مثلاً؛ ایک پودا ہے، اس کو ہم کھانے میں استعمال کر رہے ہیں، وہ دوا میں بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن دوا میں کیوں استعمال ہوتا ہے، اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ نے اس میں دوا کی بھی خصوصیت رکھ دی ہے، پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم برابر ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں اور سب کچھ ہمارے ہی کرنے سے ہو رہا ہے، تو چھوٹی سے چھوٹی بات بھی جو ہوتی ہے وہ بھی اسی کے کہنے سے ہوتی ہے، اور پھر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے جب وہ کام کرتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو تو وہ کام نہ کرے گی۔

انسانی فطرت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس مزاج وفطرت سے نوازا ہے وہ انسانی فطرت ہے، اس میں خوبیوں کو پسند کرنے اور برائیوں کو ناپسند کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ

"الاثم ما حاك فی نفسك"(۱) (گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے)

آدمی کا ضمیر اور اس کا دل ایسا ہے کہ وہ اچھی بات کو اچھا اور بری بات کو برا سمجھتا ہے، لیکن اس کے بعد ایک اہم سوال یہ ہے کہ پھر وہ برائیوں میں کیوں مبتلا ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ برائیوں میں مبتلا ہونے کا ایک بڑا سبب اس کی نفسانی خواہشات ہیں، خواہشات کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیزیں جن سے جسمانی آرام ملے، جن سے کچھ دیر کے لیے آدمی کو اچھا لگے، اس کو خوشی حاصل ہو، خواہ اس سے کسی کو نقصان پہنچ رہا ہو، یا اس کے نتیجہ میں کوئی غلط بات ہو رہی ہو، تب بھی آدمی اس کو اختیار کر لیتا ہے، مثلاً؛ اگر کسی کو کھانے کا شوق ہے تو وہ محض اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے دوسرے کا حق مار لے گا، البتہ یہ بات طے ہے کہ انسان جو بھی برائی کرتا ہے تو اس کو برا سمجھتا ہے، اس کا ضمیر محسوس کرتا ہے کہ یہ بات بری ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تفسیر البر والاثم: ٦٦٨١

www.abulhasanalinadw.org

خدائی نظام

اللہ تعالیٰ جس کی ذات بہت ہی رحمٰن و رحیم ہے، اس نے یہ انتظام فرمایا کہ جب لوگوں میں ان کی نفسانی خواہشات پر تعمیل کے نتیجہ میں برائیاں عام ہو جائیں، تو ان کو سمجھانے والے آئیں، اور ان کو بتائیں کہ تم غلطی کر رہے ہو، برا کام کر رہے ہو، اور ان کے رشتہ کو اللہ تعالیٰ سے جوڑیں، وہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ اچھے برے کو اللہ تعالیٰ نے ہی بنایا ہے، انسان کا جو مزاج بنایا ہے وہ بھی اللہ ہی نے بنایا ہے، اس میں اچھے برے کا فرق سمجھنے کا مزاج بھی رکھا ہے اور اس کو نفس بھی عطا فرمایا ہے، جس کی اپنی خواہشات ہوتی ہیں، لہٰذا کامیاب شخص وہ ہے جو اچھے برے کی تمیز کرے، اور یہ دنیا جو انسانوں کے لیے ''دارالامتحان'' ہے، اس میں انسانوں کے بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان کو آزمایا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں یا اپنے مالک حقیقی کے احکام کی، اپنے نفس کی قربانی دے کر نیکی پر عمل کرتے ہیں یا کسی اور چیز پر، چنانچہ اگر انہوں نے اپنے نفس کی پیروی کی تو ان کا انجام کار جہنم ہوگا، اور اگر برے کاموں سے اپنی طبیعت کو روکے رکھا تو ان کے لیے بطور انعام جنت میں ہمیشہ ہمیش کے مزے ہوں گے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَأَمَّا مَن طَغَى ☆ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ☆ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَى ☆ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى ☆ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى﴾ (النازعات: ۳۷-۴۱)

(تو جس نے سرکشی کی، اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو یقیناً جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہے، اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو اس نے خواہشات سے روکا، تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے)

یعنی جس شخص نے اللہ کے لیے اپنی طبیعت کو روکا، یہ سمجھ کر کہ اللہ نیکی کو پسند کرتا ہے اور برائی کو ناپسند کرتا ہے اور نیکی اور برائی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو پیدا اسی لیے

www.abulhasanalinadw.org

کیا ہے کہ وہ دیکھ سکے کہ لوگ نیکی کی بات مانیں گے یا اپنے نفس کی بات مانیں گے۔

نظام کائنات

کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے، یہ سب اللہ کا بنایا ہوا ہے اور اس پورے نظام کی حیثیت مطیع وفرمانبردار کی ہے، اس میں ہر چیز وہی کرے گی جیسا اللہ نے اس کو بنا دیا ہے، سوائے انسان اور جنوں کے کہ ان کو اللہ نے اختیار بھی دیا ہے، باقی چیزوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے، جو فطرت اللہ نے ان چیزوں کی بنا دی ہے وہ کیفیت وفطرت ان کی فطری ہو جاتی ہے، وہ چیزیں اس کے خلاف نہیں کر سکتیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے درخت بنایا، لیکن وہ خود اپنی طرف سے کچھ نہیں کر سکتا، جس طرح اللہ نے اس کا طریقہ طے کر دیا ہے اسی طریقہ سے وہ درخت بنے گا، پہلے مرحلہ میں بیج سے پودا بنے گا، پھر اس کو پانی ملے گا تو وہ بڑھے گا اور آہستہ آہستہ درخت بن جائے گا، لیکن ایسا ہو جائے کہ وہ خود سے کچھ کر لے؟ مثلا: ایک پھل کا درخت ہے، وہ دوسرے پھل میں تبدیل ہو جائے، یا یہ کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ چلا جائے، یہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کو خود سے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، اسی طرح کائنات میں ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو خود سے کوئی اختیار نہیں ہے، ان کو جیسا اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے ویسا ہی وہ کام کرتی ہیں، البتہ اس کی مخلوقات میں انسان اور جنات ایسے ہیں جن کو اس نے ایک خاص دائرہ میں اختیار بھی دیا ہے تاکہ ان کا جائزہ لے کہ وہ اپنی طرف سے اللہ کی کتنی اطاعت کرتے ہیں، حالانکہ یہ بات اللہ کی قدرت سے باہر نہیں کہ وہ ان کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دے، ان کا ایسا مزاج بنا دے کہ وہ اطاعت کے علاوہ کچھ کر ہی نہ سکیں، جیسے فرشتے ہیں وہ سوائے اطاعت کے کچھ نہیں کر سکتے، اللہ جو چاہے گا فرشتے ویسا ہی کریں گے، لیکن انسانوں اور جنوں کو اللہ نے اختیار دیا ہے کہ اگر ان کی طبیعت نہ چاہے تو وہ اس کے خلاف کر سکتے ہیں۔

نبی اور رسول

غرض کہ اللہ تعالیٰ کا نظام یہ ہے کہ جب لوگوں میں اپنے نفس پر تعمیل کی وجہ سے خرابیاں بہت پیدا ہوجاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر قوم میں اصلاح کرنے والے پیدا کرتا ہے، گذشتہ قوموں میں جو لوگ اصلاح کرنے کے لیے اٹھتے رہے وہ عام طور پر نبی ہوتے تھے، اصطلاح میں ان کے لیے ''نبی'' اور ''رسول'' کے دولفظ استعمال ہوتے ہیں، نبی؛ آئندہ کی خبر دینے والے، پیشین گوئی کرنے والے کو کہتے ہیں، اور رسول؛ وہ ہے جو اپنے رب کا پیغام لے کر آیا ہو، لہٰذا قرآن وحدیث میں جہاں ''رسول'' کا ذکر ہوتا ہے، اس سے مراد اللہ کا پیغام لانے والا ہوتا ہے، اور جہاں یہ ہوتا ہے کہ جو آخرت کی خبر دینے والا ہے، یہ بتانے والا ہے کہ بعد میں کیا ہوگا تو وہ ''نبی'' ہے، قرآنی آیات اور احادیث نبویہ ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل دوسری قوموں میں نبی ورسول آتے تھے، اور وہ لوگ اصلاح کا کام کرتے تھے، ان کے پاس اللہ کی طرف سے فرشتہ کے ذریعہ وحی آتی تھی، لیکن حضور ﷺ پر پہنچ کر نبوت ختم کردی گئی، آپ کو اللہ نے آخری نبی بنایا، اور یہ طے کردیا کہ آپ کے بعد کسی پر وحی نہیں آئے گی، لیکن آپ جو کام کرتے ہیں یہ کام لوگ کرتے رہیں گے، اور جو لوگ آپ کا یہ کام کریں گے وہ داعی، مبلغ، مصلح کہلائیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے وہ کام لے گا جو گذشتہ قوموں میں نبیوں سے لیتا تھا۔

انبیاء کی قربانی

انبیائے کرام کے حالات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی قوم میں نبی آیا اور اس نے اپنی پوری زندگی صرف کردی، لیکن اس قوم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، لوگوں نے اس کی بات کو نہیں مانا، آخر میں نبی نے اللہ سے یہ عرض کیا کہ اے پروردگار! ہم ساری کوشش کر چکے، لیکن یہ بالکل پتھر کی طرح

ہیں، یہ اپنی طبیعت سے ہٹنے کو بالکل تیار نہیں ہیں، نہ ہی یہ لوگ خیر کا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ ہیں، لہٰذا اب ان کو دنیا میں رہنے کا حق نہیں ہے، ان کو ختم کر دینا ہی مناسب ہے، چنانچہ ایسے لوگوں کو نبی کی دعا پر اللہ تعالیٰ نے عذاب بھیج کر ختم کر دیا، پھر اس کے بعد نئی قوم وجود میں آئی، وہ اس طرح کہ اس قوم میں کچھ وہ لوگ ہوتے تھے جو اسی قوم میں سے مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے نبی کی دعوت کو قبول کیا تھا، چنانچہ انہیں چند آدمیوں کی نسل میں اللہ تعالیٰ نے برکت عطا فرمائی، اور پھر کچھ عرصہ بعد نئے سرے سے پوری قوم تیار ہو گئی۔

قرآن مجید میں انبیاء کی فہرست میں حضرت نوح علیہ السلام کا خاص طور پر ذکر آتا ہے، ان کی ایک ہزار سال کی عمر ہوئی اور ساڑھے نو سو سال انہوں نے دعوت و تبلیغ کا کام کیا، لوگوں کو برائیوں سے روکا، لیکن آخر میں وہ بالکل مایوس ہو گئے تو انہوں نے اللہ سے کہا کہ اے پروردگار! اب ان کو آپ ختم کر دیں، یہ سڑے ہوئے لوگ ہیں، ان کا دنیا میں رہنا فساد ہی کا باعث ہے، یہ دنیا میں رہنے کے قابل نہیں ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پانی کے زبردست سیلاب سے تباہ کر دیا۔

معجزات کا مقصد

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں کا حال بیان کیا ہے، یہ بتایا ہے کہ نبی لوگوں کو سمجھاتا ہے لیکن وہ نہیں مانتے، آخر میں نبی ان کو سمجھانے اور مطمئن کرنے کے لیے معجزات دکھاتا ہے، یعنی وہ عمل دکھاتا ہے جو انسان کے بس میں نہیں ہے، معجزہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایسی چیز دکھانا جو دوسرے کے اختیار میں نہ ہو، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ڈنڈا پھینکا اور سانپ بن گیا، اور وہ اژدہا بن کر سارے سانپوں کو کھا گیا، ظاہر ہے کہ ہر کوئی یہ بات جانتا ہے کہ انسان کے کرنے سے ڈنڈا سانپ بن ہی نہیں سکتا، ڈنڈا تو ڈنڈا ہی رہے گا، وہ ٹوٹ سکتا ہے، لیکن اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا، اور انسان بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا، اس لیے کہ اللہ نے ڈنڈے کا جو

www.abulhasanalinadw.org

مزاج بنادیا ہے وہ اسی پر رہے گا، لیکن دفعۃً ڈنڈے کا سانپ کی شکل اختیار کر لینا اس بات کی علامت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی دوسری طاقت سے ایسا کیا ہے، یہ خود اپنی طرف سے ایسا نہیں کر سکتے، یہ کوئی دوسری طاقت ہے جو ان کو حاصل ہوئی ہے، لیکن اس طاقت کو ان کی قوم نے یوں سمجھا کہ جادو سے بھی کچھ چیزیں ایسی ہو جاتی ہیں، اصل چیز دوسری شکل میں نظر آنے لگتی ہے، یا اس میں بظاہر حرکت معلوم ہونے لگتی ہے، اس لیے ان لوگوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہیں۔

یہاں پر حضرت موسی علیہ السلام کی بات نہ ماننے کی بنیادی وجہ وہی تھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا کہ وہ جو بات کہہ رہے تھے، وہ ان لوگوں کے دل کے خلاف تھی، ان کی خواہش کے خلاف تھی، اسی لیے وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، یہ بات ان کی خواہش کے خلاف تھی کہ وہ جس طرح نذر و نیاز مانتے تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ یہ بت ہمارا فائدہ کریں گے اور ان کے ذریعہ سے ہماری تکلیف دور ہوگی، ہمیں اللہ سے مانگنے کی ضرورت نہیں ہے، گرچہ وہ اللہ کو مانتے تھے مگر اس کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سارا نظام کائنات بنایا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ رٹائر ہوگیا اور یہ سارا نظام چلانے کی ذمہ داری ان لوگوں کے ذمہ آ گئی، جب کہ اس قسم کا اعتقاد جس کو شرک کہتے ہیں، یہ ایسی لچر بات ہے کہ انسان کو تعجب ہونا چاہیے کہ وہ اس مفروضہ کو کیسے قبول کر لے۔

بت پرستی سے قبل

بت پرستی سے قبل سارے لوگ ایک ہی مذہب پر قائم تھے، حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے جو دین عطا فرمایا تھا، وہی دین سب کا دین تھا، سب اسی کے ماننے والے تھے، لیکن جب حضرت آدم علیہ السلاام کی اولاد بڑھتی رہی اور بیٹوں کے بیٹے ہوتے رہے، پوتے پر پوتے ہوتے رہے، اور حالات بھی پیش آتے رہے تو اس وہم نے ان کو بتدریج بت پرستی پر لگادیا، وہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کو نبی اور بڑا بزرگ سمجھتے تھے،

www.abulhasanalinadw.org

لہٰذا یہ سوچا کہ ان کو یاد کر لینا اور ان کا نام لینا اس میں ہمارا فائدہ ہی ہوگا، اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا، تو یہاں سے بات شروع کی، اس کے بعد "اللہ خوش ہوگا" یہ بات نکل گئی اور اب یہ ہے کہ ہمارا کام چل جائے گا، اور ہمارا فائدہ ہو جائے گا، چنانچہ اس کے بعد جو نیک لوگ گذرے، ان کے ماننے والے بھی اسی طرح ان کو مقدس ماننے لگے، اور مقدس مانتے مانتے ان کی عبادت کرنے لگے، اور اس عبادت کو ضروری سمجھنے لگے، پھر یہ ہوا کہ ان کی عبادت کرنے کے لیے کوئی چیز علامت ہونی چاہیے، خالی ہوا میں کیسے عبادت کریں، تو ایک چیز علامت کے طور پر سامنے رکھ لی گئی، اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سب کچھ اسی علامت کو سمجھنے لگے، اور خدا کو ماننے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھنے لگے کہ خدا تو سب سے بڑا ہے، لیکن اب وہ کہاں یہ تکلیف کرے گا کہ ہماری بات سنے، اور ہماری مدد کرے، ہمیں تو جیسے دنیا میں ہوتا ہے کہ بادشاہ ہے، بادشاہ ہر کام نہیں دیکھتا اور نہیں کرتا، بلکہ جو اس کے ملازمین ہوتے ہیں ان سے کام چلتا ہے، لوگ سوچتے ہیں کہ اصل بادشاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے، وہ کہاں ہمارے چکر میں پڑے گا، اس سے بہتر ہے کہ اس نے جو آدمی مقرر کیے ہیں، انہیں سے ہم اپنا کام چلالیں، چنانچہ جب یہی چیز لوگوں نے دین کے سلسلہ میں تصور کر لی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو یقیناً ہے، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ سے نہیں لینا ہے، بلکہ ہمیں تو انہیں سے ملے گا جو اللہ کے پسندیدہ ہیں، ان کے اسی تخیل کی ترجمانی قرآن مجید ان الفاظ میں کرتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾ (الزمر: ۳)

(اور جن لوگوں نے اس کے علاوہ کارساز بنا رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم ان کی بندگی اس لیے کرتے ہیں تا کہ یہ ہمیں اللہ سے مرتبہ میں قریب کر دیں)

گویا مشرکین ان بتوں کو اصل خدا نہیں مانتے، مگر ان کی عبادت اس لیے کرتے

ہیں کہ یہ ان کو اللہ سے قریب کر دیں گے، یہ ان کا کام کر دیں گے، تو ان کا اکرام و عبادت کرنا اس لیے ہے کہ یہ ان کو اس خدا تک پہنچا دیں گے، اور خوش ہو کر اللہ سے ان کی سفارش کر دیں گے، براہ راست وہ اس سے نہیں مانگ سکتے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ ہم وسائط نہ اختیار کریں، اسلام میں وسائط نہیں رکھے گئے، براہ راست اللہ سے مانگنے کا حکم ہے، اس سلسلہ میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو منع کیا گیا ہے، بار بار یہ کہا گیا ہے کہ ہر انسان اللہ سے براہ راست مانگے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز دیتا ہے، ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ویسا بادشاہ نہیں سمجھنا چاہیے جس نے ملازم مقرر کر دیئے ہیں، اور کام کرنے کے لیے اپنا ایک اسٹاف بنا دیا ہے، اور خود تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا ہے، نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر کام کو دیکھ رہا ہے، قرآن مجید میں کئی جگہ یہ بات آئی کہ کوئی چیز بھی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو وہ ہمارے کرنے سے ہوتی ہے، اور ایک ایک حبہ جو ہے اس کو ہم ہی دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں، ہر کام ہماری ہی اجازت سے ہو رہا ہے، کوئی چیز خود سے کچھ نہیں کر رہی ہے، ہمارے کرنے سے سب کچھ ہو رہا ہے، مثلاً: دوائیں جو اثر ڈالتی ہیں، وہ اس لیے نہیں کہ خود دواؤں میں کوئی اثر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو اللہ نے اثر ڈالنے کا ذریعہ بنا دیا ہے، دوا اللہ کے کہنے سے اثر کرتی ہے، اس کے اندر خود سے اثر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے توحید اور شرک کا فرق ہو جاتا ہے، آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کیا کرے گا وہ تو بہت بڑا ہے، ہمارا کام تو یہ چیزیں کرتی ہیں، ان چیزوں میں یہ صلاحیت موجود ہے، اللہ فرماتا ہے کہ ان چیزوں میں بذات خود یہ صلاحیت نہیں ہے، بلکہ ان کے اندر یہ صلاحیت ہم نے ڈالی ہے تب یہ کام کرتی ہیں۔

شرک کی ابتداء

شرک کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ پہلے جو نیک لوگ پیدا ہوئے، وہ اپنی نیکی پر قائم رہے اور اچھی بھلی زندگی گذار کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے، حضرت آدم علیہ

السلام نیک تھے اور عام طور پر ان کی اولاد بھی نیک تھی، اس طرح نیکی چلتی رہی، لیکن جب ان لوگوں میں سے کسی نیک آدمی کا انتقال ہوگیا تو اس کے آل واولاد اور تعلق والوں کو ان کی یاد آئی کہ وہ بڑے اچھے اور بابرکت آدمی تھے، چنانچہ وہ لوگ ان کے بارے میں یہی خیال کر کے ان کو یاد کرتے رہے اور ان کو بڑا سمجھتا رہے، یہاں تک کہ اس سلسلہ میں انہوں نے غلو اختیار کیا، پھر ان کی تصویر بنالی اور اس کو یہ سمجھنے لگے کہ اس تصویر سے مانگنا اور اس سے کچھ کہنا، اس پر امید رکھنا کافی ہے، کیونکہ یہ بڑے بزرگ تھے اس لیے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں، ٹھیک اسی طرح آج کے زمانہ میں اہل بدعت نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ بھی دوسروں کے حق میں تصرف کا خیال رکھتے ہیں، غرض کہ اول زمانہ میں یہ ہوا کہ اگر ان صالحین میں سے کسی کی کوئی علامت باقی رہ گئی تو اس کی پوجا کرنے لگے، اس کو یہ سمجھنے لگے کہ اس سے ہمیں فائدہ حاصل ہوگا۔

عربوں کے جو بت تھے، وہ درحقیقت انہیں لوگوں کی کوئی خاص یادگار تھے، مدینہ منورہ میں جو بت تھا، وہ دراصل ایک پتھر تھا جس پر کسی زمانہ میں ایک بزرگ عبادت کرتے تھے، ان بزرگ کے انتقال کے بعد ان کے اس پتھر سے لوگ برکت حاصل کرنے لگے، پھر اس کے سامنے جھکنے لگے، پھر اس سے نذریں ماننے لگے، حتی کہ ایک وقت وہ آیا کہ انہوں نے اسی کو اپنا معبود سمجھ لیا، یہ عقیدہ بنالیا کہ یہ پتھر سب کچھ کرسکتا ہے، یہ ہم کو نفع ونقصان پہنچانے پر پوری طرح قادر ہے، اس لیے کہ یہ پتھر ان بزرگ کی علامت ہے، چنانچہ ایک عرصہ بعد محض وہ پتھر ہی نہیں رہا بلکہ اس کو ایک مورتی بنالیا اور کہا کہ یہ اصل پتھر کا نمائندہ ہے، اس کی طرف سے نائب ہے، اور اسی کی پوجا کی جانے لگے، اسی طرح مشرکین کے یہاں ایک دوسرا بت تھا، جس کے متعلق آتا ہے کہ ایک بزرگ کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر عبادت کرتے تھے، کچھ عرصہ بعد اس درخت کی ہی عبادت ہونے لگی، یہ تصور عام ہوگیا کہ یہی وہ درخت ہے جس کے نیچے بیٹھ کر فلاں بزرگ عبادت کرتے تھے، چنانچہ اس میں برکت وتقدس آگیا

www.abulhasanalinadw.org

ہے، اس لیے اس کو پوجنا چاہیے، نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد علامت کے طور پر وہاں ایک مورتی رکھ دی گئی، کیونکہ یوں درخت کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اس لیے ایک شکل بھی بنا کر رکھ دی، تا کہ عبادت میں من لگے، غرض کہ اس طریقہ سے بت عام ہو گئے، اور بت پرستی کا رواج ہو گیا، حالانکہ عربوں میں پہلے بت پرستی نہیں تھی، وہ خود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر کہتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ ان میں خرافات پیدا ہو گئیں، جیسے ہر قوم میں پیدا ہو جاتی ہیں، جب ان لوگوں نے یہ دیکھا کہ دوسرے علاقوں کے لوگ اس طریقہ پر بتوں کو پوجتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذریعہ ان کا کام ہو جاتا ہے، تو انہوں نے بھی یہ کام شروع کر دیا، حالانکہ اگر اللہ کی طرف سے اجازت ہوتی ہے تو کام ہوتا ہے ورنہ نہیں، لیکن اگر ہو جاتا ہے تو یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان بتوں نے کر دیا، اور اگر نہیں ہوتا تو یہ سوچتے تھے کہ ان کی عبادت میں کوئی کمی رہ گئی، گویا یہ لوگ ہر حال میں ان معبودان باطل کے متعلق اچھا ہی تصور کرتے تھے، اسی تصور کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان کے یہاں بتوں کی فراوانی ہو گئی، یہاں تک کہ ہر قبیلہ کا بت الگ الگ ہو گیا، اس کی وہ پوجا کرنے لگے اور اس طرح بت پرستی عام ہو گئی۔

خدائی قانون یہ ہے کہ جب بت پرستی بہت بڑھ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کا نظم فرماتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل شرک ہے، کیونکہ ساری قوت و طاقت اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے، ساری کائنات اسی نے بنائی ہے، ساری مخلوقات اسی نے پیدا کی ہیں، اور یہ طے ہے کہ اس نے جس کو جیسا بنا دیا ہے وہ اس سے فرق نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ خود اس میں تبدیلی کر دے، لہٰذا کسی کا دوسروں کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ ہمارا کام انجام دے دے گا، یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ دنیوی اعتبار سے ہم یوں سمجھ لیں کہ جس طرح ہم لوگ چمچہ استعمال کرتے ہیں، اس سے ہم غذا اپنے منھ تک پہنچاتے ہیں، اب اگر کوئی آدمی اپنے ہاتھ کو نہ دیکھے اور یہ سمجھے کہ یہ چمچہ ہی اس کو کھلا رہا ہے، اور اسی کو اپنا رازق سمجھنے

لگے تو یہ بے وقوفی کی بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ ٹھیک اسی طریقہ سے بت پرستی بھی عام ہوئی ہے کہ لوگ مالک حقیقی کو بھول کر پتھروں کو سب کچھ سمجھ بیٹھے۔

مشرکین کا حال

مشرکین کا حال دیکھیں کہ جب ان سے معبود بنانے کا کوئی اصول پوچھا جائے تو وہ خود نہیں بتا سکیں گے کہ معبود بنانے کا کیا اصول ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی چیز کو معبود بنائے ہوئے ہے، کوئی کسی چیز کو، اور کسی کو معبود بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہم کو وہ چیز دلا سکتے ہیں، یہ ہمارا وہ کام کر سکتے ہیں جو انسان نہیں کرسکتا، حالانکہ پتھر وہ کام کیسے کرسکتا ہے جو انسان نہیں کرسکتا؟ اور اسی طرح لکڑی کیسے کرسکتی ہے، درخت اور جانور کیسے کرسکتا ہے، جن معبودان باطل کو انسانوں نے معبود بنا رکھا ہے، ان کو دیکھیں تو ان کا ذرا بھی عقل سے تعلق معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ چیزیں ایسی ہیں کہ سب دیکھ رہے ہیں کہ وہ خود کچھ نہیں ہیں، بلکہ انسان ان کو جس طرح چاہے استعمال کرے، چاہے تو اٹھا کر پٹخ دے، توڑ دے یا جو چاہے کرے، وہ اس سے انکار بھی نہیں کرسکتیں، تو ایک طرف انسان اس پر پوری طرح حاوی ہے، وہ جو چاہے اس کے ساتھ معاملہ کرے، اور دوسری طرف مشرکین یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ہم پر حاوی ہیں، اور ہمارے سارے کام انجام دینے پر قادر ہیں، یہ ہماری مصیبت کو ٹال سکتے ہیں، پریشانی رفع کرسکتے ہیں، ہمیں کامیاب بنا سکتے ہیں، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں کیسے جوڑ کھا سکتی ہیں، ان باتوں کا عقل سے بالکل تعلق نہیں ہے، مگر افسوس کہ انسانوں نے اس کو نہ سمجھا اور بت پرستی میں ڈوبتے چلے گئے، چنانچہ یہی بت پرستی عربوں میں اندھا دھند قسم کی آئی، بت پرستی ان کے یہاں اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اخیر میں بہت بڑھ گئی تھی، کیونکہ بے عقلی کی کوئی حد نہیں ہوتی، عقل کی تو پھر بھی حد ہوتی ہے، لیکن بے عقلی کے بعد کوئی حد نہیں، انسان جو چاہے کرے۔

www.abulhasanalinadw.org

انتہائی ناپسندیدہ چیز

اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت زیادہ ناپسند ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، کیونکہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے، سارا احسان اسی کا ہے، ذرہ ذرہ اسی کا بنایا ہوا ہے، اور اس نے انسان کے فائدہ کے لیے ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے، زمین میں غلہ اور پھلوں کے پیدا ہونے کی صلاحیت رکھی، جانوروں کو پیدا کیا، چاند وسورج کی گردش بنائی، اور ان سب کا مقصد یہی بتایا کہ یہ سب چیزیں انسانوں کے فائدہ کے لیے ہیں، گویا یہ سب چیزیں انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، ہم انسانوں پر یہ اس کا کرم ہے، لیکن ہم اس کو بھول کر ایسی چیزیں اختیار کر لیتے ہیں جن کے متعلق صاف نظر آتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتیں، لیکن ہم ان کو سمجھتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ انہیں سے مل رہا ہے، ہم کو سارا فائدہ انہیں سے حاصل ہو رہا ہے، لہٰذا انہیں سے مانگنے سے ہم کو حاصل ہوگا، تو اللہ کو ظاہر ہے یہ بات ہرگز پسند نہیں ہوسکتی ہے؟ کیونکہ یہ کھلا ہوا شرک ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ شرک ہی ناپسند ہے، شرک میں مبتلا ہونے کے بعد انسان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے بعد دنیا کی ساری لغویات میں پڑ جاتا ہے، ہر طرح کے گناہ اور برائیاں اختیار کر لیتا ہے، جس کی ایک بڑی وجہ خواہش نفس پر تعمیل ہے جو اس کو ہر برائی کے کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے، اس لیے کہ اس کے سامنے کوئی تعلیم نہیں ہوتی، وہ جس کی عبادت کرتا ہے وہ اس کو نہ کچھ بتا سکتا ہے، نہ سکھا سکتا ہے، نہ توجہ دلا سکتا ہے، اس کے نزدیک بس یہ بات ہے کہ پوجا کر لی جائے اور اس کے بعد جو کیا جائے سب جائز ہے۔

معزز ترین مخلوق

اللہ تعالیٰ ہر ایک کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہے، ظاہر ہے کہ ہر کوئی اسی کی مخلوق میں سے ہے، ہر ایک کے اندر جو طبیعتیں اور فطرتیں اور جو خصوصیات ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں، جس نے مختلف خصوصیات بنا کر انسانوں میں

ڈالی ہیں، اور دوسری مخلوقات پر انسانوں کو اختیار دیا ہے، اور بعض ایسی خصوصیات بھی عطا کی ہیں جو دوسری مخلوقات کو ملنے کے علاوہ جنات بھی اس سے محروم ہیں، ان کی خصوصیات سے انسانوں کی خصوصیات کچھ بڑھی ہوئی ہیں، جس کا علم قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ آدَمَ﴾ (الاسراء: ۷۰)

(اور یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی)

یعنی انسان کو معزز ترین بنایا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو اپنا خلیفہ و نائب بنایا ہے، تو یقیناً وہ خلیفہ ساری مخلوقات سے بہتر ہوگا، جبھی خلافت کا کام اس کے سپرد کیا جائے گا، اسی لیے دنیا میں جو بھی فائدے اور نعمتیں ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ انسان کے فائدے کے لیے متعین کیا ہے، تاکہ انسان اس دنیا میں اچھی طرح کام کر سکے، اور حسن کارکردگی کی اعلیٰ مثال پیش کر سکے، اس لیے کہ جب آپ کسی سے کام لیں گے تو اس کام کو انجام دینے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، جس صحت کی ضرورت ہے اور جن دوسری خصوصیات کی ضرورت ہے جب وہ ہوں گی تبھی آپ وہ کام کسی کے سپرد کریں گے، اور اگر کوئی اس فن سے واقف نہ ہو جس کی ذمہ داری ڈالی جا رہی ہو تو اس کو انجام دینا مشکل ہے، اسی لیے جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنانے کا فیصلہ فرمایا تو انسان میں وہ خصوصیات اور صلاحیتیں رکھیں جو اس کام میں معاون ہوں، اور انسان اس کام کو انجام دے سکے، اور پھر یہ کہ جب وہ اس کام کو انجام دے گا تو اس کو زندہ رہنے کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑے گی، تاکہ وہ صحیح طریقہ سے کام کر سکے، چنانچہ وہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمادیں اور ان کو طے فرمادیا، اب اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو سمجھ میں آئے گا کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر کتنا بڑا انعام کیا کہ اس کو بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں، جب کہ وہ خود اپنی ذاتی حیثیت سے اتنا کم اور چھوٹا ہے کہ اگر خود اسی پر سب کچھ چھوڑ دیا جائے تو

www.abulhasanalinadw.org

وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا، بچہ کو دیکھیں اس میں کوئی صلاحیت نہیں ہوتی، وہ خود سے کوئی کام نہیں کرسکتا، لیکن اللہ اس کو پھر ایسے مواقع عطا فرماتا ہے، ماحول اور علم کے ذریعہ اور جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عقل دی ہے اس کے ذریعہ کہ وہ ان چیزوں کو سمجھتا چلا جاتا ہے۔

خدائی نعمتوں کا تقاضا

ہر انسان پر ان خدائی نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، سب سے بڑا شکر تو اس بات کا کہ اس نے خلیفہ بنانے کا فیصلہ فرمایا، پھر یہ کہ انسان کو خلافت یعنی نیابت دی جارہی ہے تو اس کو نیابت کے لائق بنایا، جو کام اس کے سپرد کیا گیا، اس کام کے لائق بنایا، اب کام کے لحاظ سے جو تقاضے ہیں وہ ان کو پورا کرسکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس میں کام کی یہ صلاحیت پیدا نہ کرتا تو ظاہر ہے کہ وہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا، تو ایک طرف تو اللہ تعالیٰ اس پر یہ انعام فرمارہا ہے کہ وہ اس کو اپنا نائب بنارہا ہے، اور دوسری طرف انسان کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنے کو اس کے قابل نہیں بنارہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نالائقی کررہا ہے، کیونکہ اللہ کی مرضی کے خلاف کررہا ہے، اللہ چاہتا ہے کہ وہ نیابت کرے، خلافت کا فرض انجام دے، اور ادھر یہ حال ہے کہ وہ اپنے کو اس کے لیے تیار نہیں کررہا ہے اور اس سے اعراض کررہا ہے، گویا یہ ایک باغیانہ عمل ہوا، پھر یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کام کرنے کے لیے جن صلاحیتوں کی اور جن طاقتوں کی ضرورت ہے، وہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھی ہیں، اس میں عقل اور علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، علم سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھی ہے، جو اس کی زندگی کا مقصد ہے اس مقصد کو سمجھنے کی صلاحیت رکھی ہے، اسی کی تکمیل کے لیے اس کو دنیا میں پیدا کیا گیا، نہ کہ گھومنے پھرنے اور عیش کرنے کے لیے، یعنی اس کو جو کام سپرد کیا گیا تو اس کے لحاظ سے اس کو زندگی دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ جس انسان سے جتنا کام لینا چاہتا ہے، اس کو اسی کے لحاظ سے زندگی دیتا ہے، اسی کے لحاظ سے وسائل دیتا ہے، تا کہ وہ اچھا کام کرسکے، جیسے آپ مزدور کو

رکھتے ہیں، مزدور کو کام کرنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے اور جن سہولتوں کی ضرورت ہے وہ آپ اسے مہیا کریں گے، ورنہ وہ کام نہیں کرے گا، بلکہ وہ یہی جواب دے گا کہ ہم بھوکے پیاسے نہیں رہ سکتے، ہماری اتنی طاقت نہیں کہ ہم کوئی بوجھ اٹھا سکیں، تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے وہ ساری خصوصیات انسان کو عطا فرمائیں جن کے ذریعہ سے وہ اس عظیم کام کو انجام دے سکے، لیکن کام کرنے کی یہ خصوصیات اور صلاحیتیں تو اس کو مل گئیں، البتہ ان صلاحیتوں اور خصوصیات کو بجائے اس کے کہ اس کام کے لیے صرف کرے، وہ اپنے عیش و لطف اور مزے کے لیے کر رہا ہے، وہ کھا رہا ہے، مزے اڑا رہا ہے، جو چاہ رہا ہے کر رہا ہے، اور انہیں صلاحیتوں سے کر رہا ہے جو اس کو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، حالانکہ وہ صلاحیتیں اس کو اس لیے نہیں دی ہیں کہ وہ ہاہا اور تفریح میں صرف کرے، بلکہ اللہ کا دیا ہوا جو کام ہے اس میں صرف کرنے کے لیے ان صلاحیتوں کو دیا گیا تھا، تا کہ اس کام کی انجام دہی میں ان کو استعمال کرے، لیکن وہ ان تمام صلاحیتوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور خدا تعالیٰ کا سپرد کیا ہوا کام انجام نہیں دیتا تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کا یہ عمل ایک باغیانہ عمل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی اس کو پیدا فرمایا، ساری چیزیں عطا فرمائیں، اس کے بعد بھی وہ کام کرنے سے اگر انکار کرتا ہے تو یہ ایک باغیانہ عمل ہوا کہ اللہ نے پیدا کیا اور اللہ کی وہ ملک ہے، وہ اسی کا مملوک ہے، اللہ اس کا مالک ہے، وہ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے، اس لیے کہ وہ خالق و مالک ہے، اور خالق و مالک اس کو جو کام دینا چاہتا ہے وہ کام یہ نہیں کر رہا ہے، تو گویا اپنے مالک کی بغاوت کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بغاوت کے علاوہ ان وہبی خصوصیات کو اپنے محل پر خرچ نہ کرنے کی وجہ سے اس کو خیانت کرنے والا بھی سمجھا جائے گا، کیونکہ اس مالک نے جو صلاحیتیں انسان کو دی ہیں، جو خصوصیات دی ہیں، وہ اس لیے ہیں تا کہ وہ کام کو اچھی طرح انجام دے سکے، لیکن انہیں کو وہ اپنے نفس اور خواہش کے لیے استعمال کر رہا ہے،

بجائے اس کے کہ اصل کام پر لگائے تو یہ ایک طرح کی خیانت بھی ہوئی کہ اس کو جس کام کے لیے یہ خصوصیات دی گئی تھیں، اس میں وہ صرف نہیں کر رہا ہے، بلکہ اپنے من مانے طریقہ سے صرف کر رہا ہے، کسی کو ایک رقم دی جائے کہ اس سے تم فلاں فلاں جگہ سفر کرو، فلاں کام کرو، تا کہ فلاں مقصد حل ہو جائے، اور وہ اس مقصد میں صرف نہ کرے، بلکہ اپنی خواہش پر چلے تو یقیناً وہ قابل سزا ہوگا۔

اصل کتاب کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس زمین پر کام کرنے کے لیے خاص عمر اور خاص حالات میں پیدا کیا ہے، ہر انسان جس زمانہ میں پیدا ہوا ہے اور جن حالات میں ہوا ہے یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، یہ اتفاقی نہیں ہیں، یہ بھی ایک سمجھنے کی بات ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی اتفاقی نہیں ہے، جتنی چیزیں اللہ کی بنائی ہوئی ہیں، وہ سب چیزیں اسی کی بنائی ہوئی ہیں، جتنی چیزیں مقرر کی گئی ہیں سب اسی کی طرف سے کی گئی ہیں، دن و رات کا آنا جانا، سورج کا نکلنا ڈوبنا، چاند کا نکلنا ڈوبنا، زمین سے غلہ کا پیدا ہونا، پھول و پھل اور میوے پیدا ہونا، ان سب میں کوئی چیز اتفاقی نہیں ہے، جو بھی اللہ نے کیا ہے اور جو بھی بنایا ہے وہ اتفاقی نہیں ہے، اس میں سے ہر ایک کا ایک مقصد ہے، اور وہ مقصد انسان کو بتایا گیا ہے اور انسان کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، تو جو جس زمانہ میں پیدا ہوا ہے، اور جن حالات میں پیدا ہوا ہے وہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہی تدبیر فرمائی ہے، جیسے مزدور کو آپ لگائیں تو جو ذمہ دار ہوگا وہ مزدوروں میں سے کسی سے کہے گے کہ تم اینٹیں ڈھوؤ، تم گارا بناؤ، اور اگر وہ مزدور اپنی من مانی کرنے لگے، کہا جائے پانی لانے کو، لیکن وہ اینٹیں اٹھائے، اس سے اینٹیں اٹھانے کو کہا جائے اور وہ گارا بنانے لگے، تو وہ قابل سزا سمجھا جائے گا، اسی طرح جو کچھ انسان کے ساتھ حالات پیش آتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی

www.abulhasanalinadw.org

اتفاقی نہیں ہے، بلکہ سب اللہ کی طرف سے مقرر ہے، اور اللہ نے جو چیزیں بھی مقرر کی ہیں وہ کائنات بنانے سے پہلے مقرر کردی ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ ''کتاب'' کے لفظ سے ادا فرماتا ہے، ارشاد ہے:

﴿يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ﴾(الرعد: ۳۹)

(اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے)

اللہ تعالیٰ نے یہ عالم بنایا اور تمام مخلوقات کو بنایا، اور ان سب کو بنانے سے پہلے ان کو طے کردیا، جس کو ہم لوگ پلاننگ سے تعبیر کرتے ہیں، جس طرح ہم کوئی عمارت بنانا چاہتے ہیں تو پہلے ایک کاغذ پر یا کم از کم اپنے ذہن میں اس کا ایک نقشہ بناتے ہیں کہ اس میں اتنے کمرے ہوں گے، یہ ہوگا وہ ہوگا، پھر اسی کے مطابق وہ سب چیزیں بنتی ہیں، تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات میں جو کچھ ہونا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، اور جو بھی اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے، یہ سب پہلے سے طے کردیا گیا ہے، اور اس کو قرآن مجید میں بار بار کہا گیا کہ ہم نے یہ سب پہلے سے طے کردیا، حتی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی طے کردیا کہ کون وفادار ہوگا اور کون نالائق ہوگا۔

عربوں کی خصوصیت

اللہ تعالیٰ نے جس قوم پر قرآن مجید نازل فرمایا، اور جس قوم میں حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا وہ عرب تھے، عربوں کا مزاج بھی اللہ کے نزدیک اس کام کے لیے اولین لوگوں کا مزاج ہے، اگر عربوں کے مزاج کا جائزہ لیا جائے، ان کی زباں دانی اور ان کے جذبات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ان صلاحیتوں کے ساتھ دین کی دعوت کے پہلے رہنما ہونے کے لائق تھے، اللہ نے ان میں یہ صلاحیت رکھی تھی کہ وہ دین کے پہلے داعی بن سکیں، اور جس زمانہ میں حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا اس زمانہ میں آپ کا مبعوث فرمانا بھی اللہ کی طرف سے حکمت کے ساتھ تھا، تو اللہ تعالیٰ عربوں

کی نفسیات کو پوری طرح جانتا تھا، یعنی اندر کی جو خصوصیات ہوتی ہیں جن کو نفسیات کہتے ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف تھا، کیونکہ اسی نے سب کو بنایا ہے، اس لیے وہ سب کو خوب جانتا ہے، الغرض ان لوگوں کی طرف سے اسلامی دعوت کے سلسلہ میں جو رویہ سامنے آیا، وہ سب اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کیوں اور کیسے ہے؟ اور وہ کیا اس کے اندر گڑبڑ کرتے ہیں اور اس کے اندر کیا رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

عربوں کو کعبہ سے خاص تعلق تھا، وہ کعبہ کو اللہ کا گھر سمجھتے تھے، اور شروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم تھے، اسی لیے آخری دور تک ان میں کچھ بنیادی باتیں پائی جاتی تھیں، سارا عرب کعبہ کا احترام کرتا تھا، عرب کے سب لوگ حج کرنے آتے تھے اور کعبہ کا طواف کرتے تھے، اور اس کو یہ سمجھتے تھے کہ یہ نہایت متبرک ہے، لیکن جب ان میں بت پرستی عام ہوئی تو اس تعظیم کے ساتھ بتوں کے ساتھ بھی ان کا شغف اتنا بڑھ گیا تھا کہ جب ان میں کوئی سفر کرتا تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی بت ضرور رکھ لیتا، خواہ آٹے کا بت ہی بنانا پڑ جائے اور دوران سفر اسی کی پوجا کرتا، پھر جب کھانے کو کچھ میسر نہ ہوتا تو بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ اسی بت کو کھالیا جاتا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بت پرستی کا عقل سے کوئی تعلق نہیں، یہ سارا مسلک محض اوہام پر چلتا ہے، سچی بات یہی ہے کہ اگر شرک کی بنیاد کے متعلق پوچھا جائے تو اس کی بنیاد وہم ہی نکلے گی کہ شاید ایسا نہ ہو اور شاید ایسا ہو، یہ ''شاید'' پر سارا مسئلہ چلتا ہے، پوچھنے والا یہی جواب دے گا کہ سب لوگ کہتے ہیں کہ اس کے سامنے جھکنے سے ہمیں یہ فائدہ ہوتا ہے تو ہم نے سوچا کہ اچھا ہے ہم بھی جھک لیں اس میں کیا حرج ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اس درخت سے مانگنے پر کچھ مل جاتا ہے تو کیا حرج ہے، ہوسکتا ہے ایسا ہوتا ہو، اس لیے ہم بھی مانگ رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسی طرح بت پرستی عام ہو جاتی ہے۔

احتساب نفس کی دعوت

﴿اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ﴾

(الأنبياء: ١)

(لوگوں سے محاسبہ کا وقت قریب آ گیا ہے لیکن وہ غفلت کی حالت میں بے توجہی کررہے ہیں)

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ لوگوں کے حساب و کتاب کا وقت قریب آرہا ہے، یعنی وہ وقت قریب آرہا ہے جس میں ان کے اعمال کا جائزہ لیا جائے گا، لیکن عجیب بات ہے کہ لوگ غفلت کی حالت میں ہیں، ان کو کوئی پرواہ نہیں کہ اس زندگی کے بعد کیا ہونے والا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ پیغام حق کو سننے سے اعراض کررہے ہیں اور بے توجہی برت رہے ہیں۔

مذکورہ آیت میں حساب کا وقت قریب آنے کے دونوں مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ قیامت کا وقت قریب ہے، دوسرے یہ کہ موت کا وقت قریب ہے، زیادہ دور نہیں ہے، اب جو مکلّف ہیں یعنی بڑے ہوگئے ہیں، بالغ ہوگئے ہیں، ان کے اعمال کا حساب ہونا ہے، مگر وہ اپنی دنیا میں لگے ہوئے ہیں، انہوں نے اپنے آپ کو اسی کے سپرد کررکھا ہے، وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہاں کتنے دن زندہ رہنا ہے، صرف غفلت میں مبتلا رہتے ہیں اور یہ توجہ نہیں کرتے کہ آگے بھی جانا ہے، غرض کہ غفلت کے سبب اپنے مستقبل یعنی آخرت کے معاملہ سے غافل ہیں، البتہ ان چیزوں میں بڑے ہوشیار

www.abulhasanalinadw.org

ہیں، یعنی دنیا کمانے میں، راحت حاصل کرنے میں، مزے اڑانے میں، اس سلسلہ میں ان کی عقل بہت چلتی ہے اور وہ بہت ہوشیار ہیں، لیکن جہاں آخرت کا معاملہ آتا ہے تو وہاں غافل ہوجاتے ہیں، اس کے متعلق انہیں کچھ سمجھ نہیں آتا، اسی لیے ان کی اس حالت کے متعلق فرمایا گیا کہ اگر ابھی وہ اعراض کررہے ہیں، پیغام الٰہی سے بے توجہی کررہے ہیں، آخرت کے تصور اور آخرت میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کے خیال سے ان کا ذہن ہٹ گیا ہے، تو وہ وقت دور نہیں جس میں ان کو اعراض کرنے کا مزا چکھنا ہوگا، اعراض کا مطلب ہے: کسی چیز کو چھوڑ کر ایک طرف ہوجانا۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں پوری طرح انسانی زندگی کو گھیر لیا گیا ہے، یہ بتایا گیا ہے کہ صرف ہماری یہی دنیوی زندگی اصل نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ تو زندگیوں میں سے ایک زندگی ہے، اللہ تعالیٰ نے دو زندگیاں رکھی ہیں، ایک اصل زندگی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو شروع میں ملی تھی، اللہ تبارک وتعالی نے وہ زندگی ہمیشہ کے لیے بنائی ہے، وہ کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مکلّف بنا کر پیدا کیا تھا، چنانچہ وہ اور ان کی آل واولاد سب مکلّف ہے، مکلّف کا مطلب ہے کہ جس پر کسی کام کو انجام دینے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہو، اور اس کے اندر اس کو اختیار دیا گیا ہو۔

خدا کی قدرت کاملہ

اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات ہیں، فرشتوں ہی کی اتنی زیادہ تعداد ہے کہ ان کو کوئی شمار نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ نے مختلف نوعیت کے فرشتے رکھے ہیں، اللہ ان کے ذریعہ کام لیتا ہے، یہ پورا نظام اللہ فرشتوں کے ذریعہ چلا رہا ہے، واضح رہے کہ اللہ کو ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ صرف اپنے حکم سے پورا نظام چلاسکتا ہے، وہ کہے کہ ''ہوجا'' تو کام ہوجائے، اللہ یہ کرسکتا تھا کہ انسان کو کہے ''ہوجا'' تو انسان ایک دم سے نکل کر سامنے آجاتا، اس میں کوئی ترتیب نہ ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے دونوں طرح کا نظام رکھا

www.abulhasanalinadw.org

ہے، بہت سی چیزیں ہیں جو اللہ محض اپنے حکم سے کرتا ہے، اور بہت سی وہ ہیں جن کو ایک نظام کے ساتھ کرتا ہے، انسانوں کے نزدیک حکم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی سے کچھ کہا جائے اور وہ اس کام کو کرے، کہا جائے کہ تم یہ کام کرو، تم یہ کرلاؤ، گویا کسی کو حکم دیا گیا، اور اس نے کام کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کا یہ مطلب نہیں ہے، یہ تو برابر والے یا اپنے سے ملتے جلتے کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اس سے کہا جائے کہ یہ کام کرو، پھر اس سے امید کی جاتی ہے کہ وہ کرے گا یا نہیں کرے گا، واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ مسئلہ نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ یہ کرتا کہ سارے انسان نیک ہوجائیں تو نیک ہوجاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے سب کو بنایا ہے، سب کو پیدا کیا ہے، جب اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ انسان کی اپنی بنائی ہوئی چیز کو انسان جیسا چاہے موڑ دے، جو چیز ہم نے خود بنائی ہے، اس کو ہم توڑ دیں یا موڑ دیں، یہ ہمارے اختیار میں ہے، چاہے اس کو ہم ختم کردیں، بالکل پیس کر رکھ دیں، یا باقی رکھیں، تو خداوند کریم جس کے قبضہ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں، یہ بات اس سے کیسے مستبعد ہوسکتی ہے۔

اسی لیے یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں جو بھی چیز پیدا کی وہ اللہ کے حکم کے تابع ہے، خود اس میں کوئی صلاحیت نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی و حکم پر چلتی ہے، سمجھانے کے لیے اس کی ایک مثال دی جاسکتی ہے کہ انسان اس دنیا میں خود اپنے ہاتھ سے کتنی چیزیں بناتا ہے، لیکن جو چیزیں وہ بناتا ہے وہ خود سے کچھ نہیں کرسکتیں، اگر انسان کا بنایا ہوا پنکھا چل رہا ہے، تو وہ اس لیے چل رہا ہے کہ انسان نے اس کو آن کردیا، اب وہ خود سے نہیں رکے گا، یا خود اپنی طرف سے کوئی گڑبڑی نہیں کرے گا، البتہ ٹیکنکل طور پر اس میں کوئی خرابی پیدا ہوجائے وہ الگ بات ہے، لیکن خود اس کو ارادہ کا حق نہیں، کیونکہ اس میں ارادہ وخواہش نہیں ہے، اسی طرح چمچہ ہے، وہ خود سے آپ کو کھانا نہیں کھلائے گا، البتہ جب آپ اس کا استعمال کریں گے تو استعمال ہوگا، لیکن وہ خود اپنی مرضی سے کام نہیں کرسکتا، معلوم ہوا جو بھی چیز کسی کی بنائی ہوئی ہے تو وہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں چلتی، اس دنیا میں

www.abulhasanalinadw.org

رات دن ہم یہی دیکھتے ہیں کہ جو مصنوعات بنائی جاتی ہیں، وہ خود سے کچھ نہیں کرسکتیں، ہم انسانوں نے ان کو جس مقصد کے لیے بنایا ہے، اس مقصد میں بھی وہ ہمارے ہی کہنے سے چلتی ہیں، ہمارے کرنے سے چلتی ہیں، ان کو خود سے چلنے کا اختیار حاصل نہیں، اسی طرح یہ سارا عالم اور یہ ساری مخلوقات جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں، اس میں اسی کی مرضی چلے گی، وہ ان کو جس طرح چاہے رکھے، جس طرح چاہے کرے، یہ بالکل تابع ہیں، جو اللہ چاہتا ہے وہی کرتی ہیں۔

انسان وجن کا اختیار

اللہ تعالیٰ نے دو مخلوقات جو ہمارے علم میں ہیں: جنات اور انسان، ان کو الگ رکھا ہے، ان کو دوسرے طریقہ سے بنایا ہے، ان دونوں کو ایک حد تک اختیار بھی دیا ہے، البتہ پورا اختیار نہیں ہے، ایسا نہیں کہ جو چاہیں کریں، بلکہ ایک محدود دائرہ میں جو چاہیں کرے، مثلاً: ایک احاطہ کے اندر کسی بڑے مکان میں کسی کو ٹھہرا دیا جائے، اور کہا جائے کہ تم اس مکان میں جہاں چاہو جاؤ، جو چاہو کرو، لیکن مکان کے باہر تم نہیں جاسکتے، جس طرح یہ اختیار محدود ہوا، اسی طرح انسان کو بھی اللہ نے جو اختیار دیا ہے، وہ محدود اختیار ہے، یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہ کیا کیا کرسکتا ہے اور کیا کیا نہیں کرسکتا، سارا نظام انسان کے اختیار میں نہیں۔

استخلاف فی الارض کا مقصد

حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ایک عمل کردیا، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ یہ جنت اس کی جگہ نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ یہاں اپنی مرضی سے تم کام کرو، جتنا اختیار دیا گیا ہے، اتنا ہی تمہیں کرنا ہے، اور تم سے جو یہ غلطی ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری اولاد بھی غلطی کرسکتی ہے، یعنی ہمارے حکم کے خلاف کرسکتی ہے، اس لیے تم کو زمین پر اتارا جاتا ہے، لہٰذا فرمایا گیا کہ

تم زمین پر اتر جاؤ، اب ہم پہلے یہ دیکھیں گے کہ تم ہماری اطاعت کرتے ہو یا اپنی مرضی چلاتے ہو، ایک حد تک تمہیں اختیار دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ یہ ہدایات بھی دی گئی ہیں کہ تمہیں اختیار تو ہے لیکن اگر تم غلط عمل نہ کروگے تو ہم اس کا تمہیں اچھا بدلہ دیں گے، اس کا بہترین عوض دیں گے، تمہاری اس قربانی کا ہم تم کو فائدہ دیں گے، اور اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو پھر ہم سزا بھی دیں گے، ہم نے تمہیں تفریح کے لیے دنیا میں ہرگز نہیں بھیجا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾

(المؤمنون: ۱۱۵)

(کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یوں بے کار پیدا کر رکھا ہے، اور تم اس دنیا کے بعد ہمارے پاس واپس نہیں آؤ گے)

یعنی اس دنیا میں تم ہماری یاد سے غافل ہو کر اس طرح زندگی گذار رہے ہو کہ جو چاہتے ہو کرتے ہو، کیا تم کو اس بات کا خیال نہیں کہ ہم نے تمہیں کن کن چیزوں سے منع کیا ہے، تمہارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو ہم نے ایک کام کرنے سے منع کیا تھا، ان سے غلطی ہوئی تو تم بھول گئے کہ ان کو کیسی سزا ملی تھی، ان کو جنت سے نکلنا پڑا اور اس دنیا میں آنا پڑا، لیکن تم ہو کہ سمجھتے نہیں اور جو چاہتے ہو کرتے ہو، جب کہ تم کو بتایا جا چکا کہ یہ برا ہے اور یہ اچھا ہے، یہ نہ کرو اور یہ کرو، تب تمہارے لیے خیر ہے، لیکن اگر تم ایسا نہیں کروگے تو پھر یاد رکھو کہ جنت میں واپس نہیں آسکتے۔

دنیوی زندگی کی مثال

یہ زندگی ایک عبوری اور وقتی دور ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

"انما أنا والدنيا كراكب استظل تحت شجرة ثم راح وتركها"(۱)

(۱)سنن ابن ماجة، كتاب الزهد، باب مثل الدنيا: ٤٢٤٨

www.abulhasanalinadw.org

(میری مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی مسافر (سوار) جا رہا ہو، راستہ میں کسی درخت کے نیچے اس نے سایہ لے لیا، آرام کرلیا، پھر چھوڑ کر چلا گیا)

اس حدیث میں آپ ﷺ کا اپنی مثال دینے سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کی مثال ایسی ہے کہ کہیں سفر پر جا رہے ہیں، اور راستہ میں رکنے کا تقاضا ہوا، دوپہر کا وقت ہے، قیلولہ کا وقت ہے، گرمی بہت ہے، تو ایک درخت کے نیچے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ٹھہر گئے، ظاہر بات ہے کہ وہاں اس درخت کے نیچے چند گھنٹے آرام کی خاطر ہم اپنا مکان نہیں بنائیں گے، یا ہم وہاں اپنا نرم بستر نہیں بچھائیں گے، بلکہ وہاں کسی بھی طرح پڑے رہیں گے، اس لیے کہ ہم کو آگے جانا ہے، یہاں نہیں رہنا ہے، گویا ایک مومن کے لیے آپ نے یہ بتایا کہ مومن دنیا کو یہ نہ سمجھے کہ یہاں ہم ہمیشہ ہمیش رہنے کے لیے آئے ہیں، یوں بھی ہر انسان خود اپنی آنکھوں سے روزانہ دیکھتا ہے کہ یہاں کوئی ہمیشہ نہیں رہتا، ایک مقررہ مدت کے بعد یہاں سے اس کو جانا پڑتا ہے، اس کے رہنے کا کتنا ہی جی چاہے مگر وہ نہیں رہ سکتا، تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ جب ہمیں یہاں رہنا نہیں ہے، ہمیں تو آگے جانا ہے، ہمارا گھر آگے ہے تو پھر یہاں تماشے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بس کچھ دیر آرام کرلو، اپنی ضرورت پوری کرلو، پھر آگے چلو، آگے کی فکر کرنا چاہیے، جہاں زیادہ مدت رہنا ہے، مثلاً: دوسری جگہ برسوں رہنا ہے، راستہ میں صرف دو گھنٹے رہنا ہے، تو کیا کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ انہیں دو گھنٹے میں سارے عیش کرلے یا اس کے بعد جہاں غیر محدود مدت تک رہنا ہے، وہاں عیش کے ساتھ رہنے کی فکر کرے گا؟ جس کے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ یہاں تکلیف اٹھاؤ گے تو وہاں آرام ملے گا، یہاں آرام اٹھاؤ گے تو وہاں آرام نہیں ملے گا۔

قرآن مجید میں آتا ہے کہ جہنم میں موجود کافروں سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا:

﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ

www.abulhasanalinadw.org

بِـمَـا كُـنتُـمْ تَسْتَـكْبِـرُونَ فِيْ الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَفْسُقُونَ﴾ (الأحقاف: ٢٠)

(اور جس دن کافروں کو آگ کے سامنے لایا جائے گا (اور کہا جائے گا) سب اچھی چیزیں تم نے اپنی دنیا کی زندگی میں اڑا لیں اور ان کے خوب مزے کر لیے بس آج تمہیں ذلت کے عذاب کی سزا ملے گی اس لیے کہ تم زمین میں ناحق غرور کرتے رہے تھے اور اس لیے کہ تم نافرمانی کرتے رہتے تھے)

یعنی جو کچھ فائدے تھے وہ سب تم نے اپنی دنیا کی زندگی میں حاصل کر لیے، تمہارے لیے ہم نے جو حصے اور فائدے رکھے تھے، وہ سب تم نے دنیا میں اٹھا لیے، اب یہاں تم کو کچھ نہیں ملے گا۔

کفار کا استہزاء

﴿مَـا يَـأْتِيهِـم مِّـن ذِكْـرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ﴾ (الأنبياء: ٢)

(جب ان کے سامنے ان کے رب کی جانب سے یاددہانی کی کوئی نئی بات آتی ہے تو وہ اس کو اس حال میں سنتے ہیں کہ وہ کھیل میں مست ہوتے ہیں)

جب انسان کو یاددہانی کی کوئی نئی بات بتائی جاتی ہے تو آدمی توجہ سے سنتا ہے، بسا اوقات پرانی بات میں بے خیالی ہو جاتی ہے، یہ خیال آجاتا ہے کہ کئی مرتبہ سنا ہے اور اب پھر سن رہے ہیں، اس لیے زیادہ خیال نہیں ہوتا، لیکن جو نئی بات کہی جاتی ہے، وہ آدمی فوراً توجہ سے سنتا ہے، سوچتا ہے کہ یہ بات معلوم نہیں تھی، یہ بالکل نئی بات ہے، لیکن مشرکین کا معاملہ عجب تھا، ان کو اس طرح کی کسی بات سے کوئی سروکار نہ تھا، اسی لیے فرمایا گیا کہ اگر ان کے سامنے کوئی نئی بات لائی جاتی ہے، جو ان کے فائدہ کی ہو یا

آخرت کے معاملہ کی، تو وہ اس کو اس طرح سنتے ہیں کہ کھیل میں لگے ہوئے رہتے ہیں، یعنی اپنی تفریح میں لگے رہتے ہیں، اور تفریح کے ساتھ اس کو لیتے ہیں، ظاہر ہے تفریح کے ساتھ جب کسی چیز کو سنا جائے گا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

مشرکین کے دلوں کا قبلہ

﴿لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ﴾ (الأنبياء: ٣)

(ان کے دل تفریح میں لگے ہیں اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں جنہوں نے اپنے حق میں ظلم کیا ہے کہ یہ (نبی) جو بات کہہ رہے ہیں یہ تمہارے ہی جیسے ایک انسان ہیں، کیا تم بصیرت و سمجھ رکھنے کے باوجود جادو میں پڑ جاؤ گے)

یعنی مشرکین کے دل لہو ولعب میں لگے ہوئے ہیں اور تماشوں میں مست ہیں، ان کے دلوں کا قبلہ یہی چیزیں ہیں، اسی لیے ان کے دل کسی نئی بات یا خطرہ کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں، حالانکہ کہا جا رہا ہے کہ آگے بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے، مگر ان کو کوئی پرواہ نہیں، کسی نے کہا: بڑے زور کی آندھی آ رہی ہے، درخت اکھڑے جا رہے ہیں، لیکن سننے والا کہے ہاں ہاں ٹھیک ہے، اور پھر اپنے کام میں لگ جائے، کھانے پینے میں مصروف ہو جائے، خوش گپیوں میں مست ہو جائے، تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ آندھی آئے گی اور سب کچھ تباہ کر دے گی، اسی طرح ان کے دل آخرت سے غافل ہو کر جس لہو ولعب میں لگے ہوئے ہیں، یہ لہو ولعب ان کو تباہ کر دے گا، وہ یہ نہیں سوچتے کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ کتنی اہم ہے اور اس کا کس پر انحصار ہے۔

مذکورہ آیت میں فرمایا گیا کہ یہ لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں اور نبی ﷺ پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ جو بات کہہ رہے ہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں، اس طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں، یہ بس اپنی طرف سے اڑا رہے ہیں، ان کی باتوں کی طرف

توجہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ایسے لوگوں کے متعلق بتایا گیا کہ یہ لوگ درحقیقت ظالم لوگ ہیں، ظلم کے معنی عربی میں یہ ہیں کہ جو کام کرنا چاہیے اس سے ہٹ کر کام کیا جائے، یعنی کوئی صحیح راہ سے ہٹ جائے اور صحیح چیز کو چھوڑ کر غلط چیز میں لگ جائے یہ ظلم ہے، اسی طرح ایسا کام کرنا کہ جس سے آدمی کو نقصان پہنچے عربی کے لحاظ سے یہ بھی ظلم ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کافر بھی ظلم میں مبتلا ہے، یہ جو ظلم کر رہے ہیں، یہ اللہ کا نقصان نہیں کر رہے ہیں، نہ ہی کسی دوسرے کا نقصان کر رہے ہیں، بلکہ خود اپنے ساتھ ظلم کر رہے ہیں یعنی اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں، اپنے کو صحیح راستہ سے ہٹا رہے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے کو تباہ کر رہے ہیں اس کا کیا انجام ہوگا؟ فی الحال چھوٹی سی تفریح میں لگے ہیں اور جو اللہ کا حکم ہے اس کو نظر انداز کر رہے ہیں اور اس کی پرواہ نہیں کر رہے ہیں، نبی اکرم ﷺ جو حکم ان کو دے رہے ہیں، اس کے متعلق چپکے چپکے کہتے ہیں کہ ارے یہ ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہیں، جیسے ہم میں لوگ جھوٹ بھی بولتے ہیں، سچ بھی بولتے ہیں اور دھوکہ بھی دیتے ہیں، اسی طرح یہ ہیں، ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے، یہ ہم جیسے ہی ایک انسان ہیں، ہمارے میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو غلط سلط بات کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی کر رہے ہیں، لہٰذا ان سے دھوکہ نہ کھاؤ، یہ جادوگری کر رہے ہیں، یہ جو نئے قسم کی باتیں کرتے ہیں یعنی معجزات دکھاتے ہیں، یہ جادو ہی ہے، اور جادو میں سب کچھ ہوتا ہے، اسی جادو کو یہ معجزہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ان کو ملا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، درحقیقت یہ جادو اور فریب ہے، یہ ہم کو بے وقوف بنانے کے لیے فریب کر رہے ہیں، اس لیے ان کے چکر میں پڑنے کی کوشش نہ کرو، کیا تم لوگ ان کے پاس جادو دیکھنے جاتے ہو، جب کہ تم بصیرت و سمجھ رکھتے ہو، یعنی بجائے اس کے کہ وہ لوگ نبی کی باتوں کو مانیں اور سنیں، وہ اس سے غافل ہیں، اور جو لوگ سننے کے لیے کچھ تیار بھی ہوتے ہیں تو ان کو بہکاتے ہیں کہ ارے جادوگر کے چکر میں کیوں پڑتے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔

www.abulhasanalinadw.org

علم خداوندی

﴿قَالَ رَبِّی یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِیْ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ (الأنبیاء: ٤)

(ان سے کہا (نبی نے) کہ آسمان وزمین میں جو جو کچھ کہا جاتا ہے میرا رب اس کو جانتا ہے، اللہ تعالیٰ خوب سننے والا بھی ہے اور خوب جاننے والا بھی ہے)

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ ہمارا رب ساری باتوں کو جانتا ہے، کون کیا کہنا چاہتا ہے اس کو بھی جانتا ہے، کیونکہ کسی بات کے کہنے میں اس کا مقصد بھی چھپا ہوتا ہے، اگر مقصد نہ ہوتو اس کو ''کہنا'' نہیں بلکہ ''بکواس'' سے تعبیر کیا جائے گا، یعنی ایسے الفاظ جس کے معانی نہیں ہوتے، گویا جب تک کہنے کے پیچھے مطلب نہ ہوتب تک اس کو ''کہنا'' نہیں کہتے، اسی لیے قرآن مجید میں جگہ جگہ آتا ہے:''قـل''(کہو) یعنی اس بات کو سمجھو، اس حقیقت کو جانو، درحقیقت اس حکم میں عمل بھی چھپا ہوا ہے، سورۂ اخلاص میں فرمایا گیا:﴿قل هو اللّٰه أحد﴾ کہوا ے نبی کہ اللہ ایک ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کو سمجھو بھی، یہ نہیں کہ بس منھ سے لفظ نکال دو، بلکہ اس کے معانی پر بھی غور کرو۔

غرض کہ مذکورہ آیت میں فرمایا گیا کہ مشرکین سے نبی ﷺ نے کہا: آسمان و زمین میں جو کچھ کہا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے، کوئی کچھ کہے وہ اللہ سے چھپا ہوا نہیں ہے، تم لوگ اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے، بعد میں تاویل کرکے یہ کہو کہ ہم نے تو اس لیے کہا تھا، یوں کہا تھا، یا ہم نے یہ نہیں کہا تھا، ایسا کچھ نہیں ہے، اللہ کو سب معلوم ہے کہ کون کیا کہہ کر کیا دکھانا چاہتا ہے، کہنا بھی کرنے کی طرح ہوتا ہے، کسی کو گالی منھ سے دی جائے تو وہ کچھ کرنے ہی کی طرح ہوتی ہے، جس کا اثر مخاطب پر پڑتا ہے، اس لیے کوئی یہ کہے کہ ہم نے محض اپنے منھ سے کہا ہے اسے ہم نہیں مانیں گے، ایسا نہیں ہے، بلکہ آپ نے جو کہا اس پر غور کیجئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان وزمین میں ہے،

www.abulhasanalinadw.org

جہاں بھی کچھ کہا جائے، اللہ کو سب معلوم ہے، تم چپکے چپکے لوگوں کو بہکاؤ گے، پروپیگنڈہ کی کوشش کرو گے، یہ کہو گے کہ نبی کی باتیں غلط ہیں تو یہ کچھ بھی اللہ سے چھپا نہیں ہے، ہر چیز اس کو معلوم ہے، قیامت کے دن جب حساب ہوگا تو پتہ چلے گا، اور اس حساب کا وقت قریب ہی آ گیا ہے، جس پر قدرے روشنی ابتداء میں ڈالی گئی ہے، حساب کا وقت قریب آنے کے دونوں مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ قیامت کا وقت قریب ہے، دوسرے یہ کہ انتقال کا وقت قریب ہے، انتقال کے بعد آدمی اپنے حساب و کتاب کے لیے اللہ کے سامنے حوالہ ہو جاتا ہے، وہاں انسان کو کسی عمل کا اختیار نہیں ہوتا، نہ وہ توبہ کر سکتا ہے، نہ ہی کسی قسم کی معذرت کر سکتا ہے، اور نہ اپنی غلطی کا کوئی علاج کر سکتا ہے، جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوگا تو جو کچھ اس نے کیا ہے وہی اس کے پاس ہوگا، وہاں کوئی نئی بات کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہوگا، وہاں تو صرف حساب دینا ہوگا۔

اٹکل باتیں

﴿بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ﴾ (الأنبياء: ٥)

(بلکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ الٹے سیدھے خواب ہیں، بلکہ یہ وہ (باتیں) ہیں جو خود انہوں نے گڑھ لی ہیں، بلکہ یہ سمجھ لو کہ یہ شاعر ہیں، اگر یہ واقعی نبی ہیں تو کوئی نشانی لائیں جیسا کہ پہلے لوگ بھیجے گئے)

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ وہ چپکے چپکے ایک دوسرے کو نبی کے خلاف سمجھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ بتا رہے ہیں، وہ ''اضغاث احلام'' ہیں، جس طرح خواب میں آدمی اوٹ پٹانگ چیزیں دیکھتا ہے، ان کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، اسی طرح ان کی باتوں کا بھی کوئی مطلب نہیں، ''ضـغـث'' مختلف شاخوں یا مختلف پھولوں کو جمع کر کے ایک گلدستہ بنانے کو کہتے ہیں، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی مختلف چیزوں کو یکجا بیان فرماتے ہیں، اسی لیے ان کے خیالات کو خواب بتایا اور اس کے ساتھ

"ضـــغـــث" کا لفظ استعمال فرمایا، یعنی آپ ﷺ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی حیثیت خواب کی ہے، بلکہ خواب کی بھی حیثیت نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں جو یہ لوگوں کو سمجھاتے ہیں، انہوں نے خود ہی گڑھ لی ہیں، اسی لیے یوں بھی سمجھ سکتے ہو کہ جیسے شاعر ہوتے ہیں کہ اپنے خیالات کا عمدہ اور مؤثر الفاظ میں اظہار کرتے ہیں، یہ شاعر ہی کی طرح ہیں، اور اگر یہ واقعی نبی ہیں اور اللہ کا کلام ان کے پاس آتا ہے تو ان کو چاہیے کہ کوئی نشانی لائیں، جیسا کہ پہلے لوگوں کے متعلق ہے کہ وہ بھیجے گئے تھے اور رسول بنائے گئے تھے، اگر ایسے ہی یہ بھی رسول ہیں تو کوئی نشانی دکھائیں، اس سے پہلے جو رسول آئے تھے، ان کے پاس نشانیاں تھیں۔

حیرت کی بات ہے کہ جو پہلے رسول تھے، مشرکین ان کو مانتے ہیں، لیکن تازہ رسول کو نہیں مانتے، اور کہتے ہیں کہ جو پہلے آتے تھے، ان کی طرح یہ بھی کوئی علامت دکھائیں، تب ہم مانیں گے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، حالانکہ آپ ﷺ بھی اسی طرح کے معجزات دکھاتے رہتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ یہی کہتے ہیں کہ ان کی یہ باتیں "اضغاث احلام" ہیں۔

قانون الٰہی

﴿مَا آمَنَتْ قَبْلَهُم مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ﴾(الأنبياء: ٦)

(ان سے پہلے بھی ایسی قومیں گذری ہیں جو ایمان نہیں لائیں تو ہم ان نے ان کو ہلاک کیا، کیا یہ ایمان لے آئیں گے)

یعنی ان سے پہلے بھی ایسی قومیں اور بستیاں گذری ہیں، جنہوں نے اپنے نبیوں کی بات نہیں مانی، اسی طرح یہ بھی ہیں، تنہا یہی لوگ ایسے نہیں ہیں جو بات نہ مانتے ہوں، بلکہ اس سے پہلے بھی بار بار ایسی قومیں گذری ہیں جو ایمان نہیں لائیں، نبیوں نے اپنی پوری کوشش کر ڈالی اور معجزات دکھائے، ہر طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن انہوں نے ایمان قبول نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، اس آیت

میں فرمایا جارہا ہے کہ یہ بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں، یہ انہیں کے راستہ پر جارہے ہیں، جب وہ لوگ ایمان نہیں لائے، باوجود معجزات کو دیکھنے کے اور نبیوں کی دعوت سننے کے، تو یہ بھی انہیں کے راستہ پر چل رہے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

انبیاء کا تسلسل

﴿وَمَا أَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ إِلَّا رِجَالاً نُّوحِيۡ إِلَيۡهِمۡ فَاسۡأَلُوا أَهۡلَ الذِّكۡرِ إِن كُنتُمۡ لاَ تَعۡلَمُونَ﴾ (الأنبياء: ۷)

(ہم نے آپ سے پہلے بھی برابر ایسے لوگ بھیجے، جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے تو جو ان میں واقف لوگ ہیں ان سے پوچھ لو، اگر تم کو نہیں معلوم ہے)

اس آیت میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے پہلے بھی برابر ایسے لوگ نبی ورسول بنا کر بھیجے، جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے، یعنی اپنا کلام اور احکام بھیجتے تھے، یہ بات اگر معترضین کو نہیں معلوم ہے یا وہ نہیں سمجھ پارہے ہیں تو بنی اسرائیل اور دوسری امتوں کے لوگ جو حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو مانتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں اور ان کے پاس آسمانی کتابیں بھی ہیں تو جو لوگ ان کتابوں سے واقف ہیں، ان معترضین کو چاہیے کہ یہ ان سے پوچھ لیں۔

قاعدہ یہی ہے کہ جب ایک بات کسی کے سمجھ میں نہ آئے تو وہ بات جس کے سمجھ میں آرہی ہو اس سے پوچھ لینا چاہیے، درحقیقت ہماری زندگی اسی نظام پر چل رہی ہے کہ ایک چیز ہمارے سامنے آئی جس کے فائدہ کو ہم نہیں سمجھ پارہے ہیں، تو جو واقف ہوتا ہے وہ بتا دیتا ہے، اسی طرح ان لوگوں کو بھی چاہیے کہ اگر ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو یہ بھی ان لوگوں سے پوچھ لیں جو لوگ موجود ہیں، یعنی جو دوسری قوموں کے افراد موجود ہیں، وہ اپنے انبیاء کا حال بیان کریں تو اس سے یہ سمجھ لیں کہ

www.abulhasanalinadw.org

انبیاء کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے۔

بشریت انبیاء علیہم السلام

﴿وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَداً لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِيْنَ﴾ (الأنبياء: ٨)

(ہم نے ان کو ایسے جسم عطا نہیں کیے کہ ان کو کھانے کی ضرورت نہ پڑے اور یہ ہمیشہ رہیں)

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھیجے ہیں وہ کوئی نئی مخلوق نہیں ہیں، بلکہ انسانوں میں سے ہی کسی کو نبی بنایا ہے، لہٰذا جو ضروریات انسانوں کی ہوتی ہیں، وہ سب ان کی بھی ہوتی ہیں، ان کو بھی کھانے پینے اور کمانے کی ضرورت ہوتی ہے، ان کو بھی زندگی کے جو تقاضے ہیں وہ پورے کرنے ہوتے ہیں، گویا دیکھنے میں اور ظاہری اعتبار سے ہاتھ پیر اور کھانے پینے کے لحاظ سے نبی انسان ہی ہوتا ہے۔

مشرکین عرب نبی کی اسی چیز پر اشکال کرتے تھے کہ نبی انسان نہیں ہوسکتا، وہ کہتے تھے کہ یہ نبی کیسے ہیں، یہ بازاروں میں جاتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، نبی کو انسانوں سے مختلف ہونا چاہیے، الگ مخلوق سے ان کا تعلق ہونا چاہیے، تب یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے لیے کوئی نبی بھیجا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ان کے اسی زعم کے متعلق ارشاد ہوا کہ ہم نے ان کو ایسے جسم عطا نہیں کئے کہ ان کو کھانے کی ضرورت نہ پڑے اور یہ ہمیشہ زندہ رہیں، بلکہ وقت موعود آنے پر یہ لوگ بھی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

وعدہ کا نفاذ

﴿ثُمَّ صَدَقْنَاهُمُ الْوَعْدَ فَأَنجَيْنَاهُمْ وَمَن نَّشَاء وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (الأنبياء: ٩)

www.abulhasanalinadw.org

(پھر ہم نے ان سے (انبیاء سے) کیے وعدے کو سچا کر دکھایا تو ان میں سے جس کو ہم نے چاہا اس کو نجات دی، اور جو زیادتی پر تلے ہوئے تھے ان کو ہم نے ہلاک کر دیا)

یعنی جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انبیاء کی بات نہ ماننے کے نتیجہ میں دنیا میں عذاب نہیں آئے گا، ان کو دنیا میں عذاب نے گھیر لیا، اور انبیائے کرام سے عذاب آنے کے جو وعدے کیے گئے تھے وہ سچ ہو گئے، اور لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ جب نبی کی بات نہیں مانی تو ان کو بربادی کا سامنا کرنا پڑا، البتہ ان میں سے جس پر اللہ کا خاص فضل ہوا اس کو عذاب سے نجات ملی، لیکن جو مسرف تھے، یعنی زیادتی پر تلے ہوئے تھے، دھاندلی کر رہے تھے، ان کو ہلاک کر دیا۔

آخری آسمانی کتاب

﴿لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾(الأنبياء: ١٠)

(ہم نے تم پر کتاب نازل کی اس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تمام چیزیں واضح کر دی ہیں، اس میں تمام انسانوں کے حالات کا ذکر ہے، یعنی لوگوں کے جو مختلف حالات ہو سکتے ہیں، اچھے اور برے شخص کے، منافق و مخلص انسان کے، بدمعاش اور خوش اخلاق شخص کے، غرض کہ انسانوں کی جو مختلف صفات ہو سکتی ہیں، ان سب کی اللہ تعالیٰ نے اس قرآن میں وضاحت کی ہے، گویا ہر ایک کی زندگی اور حالات کا اس میں پورا تذکرہ رکھا گیا ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ کیا اس کا مطالعہ کر کے تم عقل سے کام نہیں لیتے، یعنی اس کی روشنی میں ہر ایک کو اپنے حالات پر غور کرنا چاہیے، اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کو کس نے پیدا کیا، کس نے ہم کو یہ سب نعمتیں دیں، جن کو ہم خود سے کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے، نہ خود سے ہم ہر چیز پر قادر تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ذات ایسی ہے جو ہم کو چلا

رہی ہے، کوئی ایسا ہے جو ہم پر حاوی ہے، کسی کے ہم محتاج ہیں، جب یہ بات آپ کے سمجھ میں آجائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ آپ اسی ذات کے احکام کی تعمیل کے پابند ہیں، اب اس کی طرف سے اگر کوئی حکم آتا ہے تو اس کو ماننا چاہیے، اس پر عمل کرنا چاہیے، ورنہ وہ تم کو مٹا بھی سکتا ہے، اس نے تم کو بنایا ہے، تو وہ تم کو توڑ بھی سکتا ہے، اس نے پیدا کیا ہے تو وہ ختم بھی کرسکتا ہے، جس کو پیدا کرنے کا اختیار ہے تو اس کو ختم کرنے کا اختیار بھی ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، یہ نہیں سوچتے کہ نبی جو کہہ رہے ہیں اس کو ماننا چاہیے، اس پر غور کرنا چاہیے، اگر سمجھ میں نہ آئے تو جو لوگ واقف ہیں، ان سے پوچھنا چاہیے۔

ظلم کا انجام

﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْماً آخَرِينَ﴾ (الأنبياء: ١١)

(اور کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ ہم نے پوری پوری بستی کو ختم کردیا (جو بستی والے) برے کردار کے لوگ تھے، اور اس کے بعد ہم نے نئے لوگ پیدا کردیئے)

تاریخ عالم میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری پوری ایسی بستی کو توڑ دیا اور ختم کردیا جس میں بڑے بڑے لوگ موجود تھے، لیکن ان کا کردارِ زندگی بہت برا ہوگیا تھا،، اور اس کے بعد نئے لوگ پیدا کردیئے جو وہاں آباد ہوئے، اور وہ پرانے لوگ جنھوں نے معصیت کی حد کردی تھی، اور اپنے نبیوں کو پریشان کیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے ختم کردیا، ان لوگوں کو نبی دعوتِ حق دیتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ ہم نہیں مانیں گے، جب نبی ان کو معجزے دکھاتے تو وہ کہتے کہ یہ جادوگری ہے، اس لیے ہم اس کو بھی نہیں مانیں گے، بس ہم اپنے باپ دادا کے طریقہ پر ہی قائم رہیں گے، خواہ تم کچھ کہو۔

جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ نبیوں کے کہنے کے باوجود، ان کی کوششوں کے

باوجود قوم کی اصلاح نہیں ہوئی تو اللہ یہ فیصلہ فرما دیتا ہے کہ دنیا میں ان کے رہنے کی ضرورت نہیں ہے، دنیا میں انسان کو اللہ نے امتحان کے لیے بھیجا ہے، یہ دیکھنے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے یا نہیں، اللہ کی عبادت کرتا ہے یا نہیں، اس کے حکموں پر چلتا ہے یا نہیں، اگر انسان یہ ثابت کردے کہ ہم بات نہیں مانیں گے اور اپنی خواہش پر چلیں گے، تو اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان زمین پر رہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جب روئے زمین پر اللہ کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہ جائے گا۔

خدا کی گرفت کا ڈر

﴿فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُم مِّنْهَا يَرْكُضُونَ ☆ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ﴾

(الأنبياء: ۱۲-۱۳)

(جب انہوں نے ہماری طرف سے عذاب کا احساس کیا تو وہ اس سے بھاگنے لگے، تم بھاگو نہیں اپنی ان جگہوں پر واپس جاؤ جہاں تم مست تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ذکر کررہا ہے جن کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے عذاب بھیج کر ان کو ختم کردیا، فرمایا کہ جب ان پر تکلیف ومصیبت آئی اور ان کو یہ احساس ہوا کہ یہ تو عذاب آگیا، اور نبی جو بات کہہ رہے تھے وہ واقعہ پیش آگیا، تو انہوں نے خیال کیا کہ ہم نبی کی مخالفت کرتے وقت یہ سمجھ رہے تھے کہ کچھ نہیں ہوگا، لیکن یہ تو جو کہتے تھے وہ آگیا، چنانچہ وہ اس عذاب کو دیکھ کر بھاگنے لگے، لیکن بھاگ کر کہاں جاسکتے تھے، اور اللہ سے چھپ کر کس جگہ پناہ حاصل کرسکتے تھے، جب اللہ کی طرف سے آندھی آئے یا بجلی گرے یا سیلاب آجائے تو کہاں بچا جاسکتا ہے، اس لیے ان سے کہا گیا کہ اب نہ بھاگو، بلکہ اپنی ان جگہوں پر واپس جاؤ جہاں تم مست تھے اور

نبی کی بات سننے کو تیار نہ تھے، اس وقت تم خوب کھا پی رہے تھے، مزے اڑا رہے تھے، بہت بہادر بن رہے تھے، شیخی دکھا رہے تھے، اب جب کہ عذاب آچکا ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ، اس وقت تم نبی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن اب وہ مصیبت آچکی ہے جس سے تم کو نبی کے ذریعہ بار بار ڈرایا گیا تھا، لہٰذا اب کہاں بھاگ رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو، اپنی جگہوں پر بیٹھو، اسی طرح عیش کرو جیسے کر رہے تھے، جن جگہوں پر تم مزے اڑا رہے تھے وہیں لوٹ کر جاؤ، انہیں جگہوں پر جاؤ جہاں سے تم عذاب کی وجہ سے بھاگ رہے تھے، اور اپنے ان گھروں میں واپس جاؤ جو عذاب کی لپیٹ میں آچکے ہیں، شاید کہ تم سے پوچھا جائے، یعنی یہ معلوم کیا جائے کہ ہماری بات حق ہے یا وہ حق ہے جو تم کہہ رہے تھے، اور یہ پوچھا جائے کہ اب وہ بات سمجھ میں آئی یا نہیں جس کو نبی تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے، اس سے پہلے تم کو ہر طرح سمجھا گیا، نشانیاں دکھائی گئیں، معجزات کے ذریعہ مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن تم اڑے گھوڑے کی طرح تھے، تم نے کوئی چیز نہیں مانی، نبی نے ہر ممکنہ کوشش کی، اپنی پوری زندگی لگا دی، لیکن تم اکڑے رہے، تو اب جب اللہ کی طرف سے مصیبت آئی ہے تو اس کو بھگتو۔

انسان کی بے بسی

﴿قَـالُـوا يَـا وَيْـلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ☆فَمَا زَالَت تِّلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّى جَعَلْنَاهُمْ حَصِيداً خَامِدِيْنَ﴾ (الأنبياء: ١٤-١٥)

(وہ کہنے لگے ہائے ہماری قسمت، ہم واقعی برا کام کر رہے تھے، بس وہ یہی سب کہتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو بالکل کٹے ہوئے کھیت اور بجھی ہوئی آگ کی طرح کر دیا)

جب اس قوم پر عذاب آ گیا تو وہ صرف یہی کہتے رہ گئے کہ ہائے ہماری قسمت! ہم واقعی غلط کام میں ملوث تھے، فرمایا گیا کہ وہ لوگ یہی سب جملے کہتے رہے، لیکن اللہ کا فیصلہ آچکا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بالکل کٹے ہوئے کھیت یا بجھی ہوئی آگ کی

طرح کر دیا، جس طرح آگ بجھ جائے تو ختم ہو جاتی ہے، اس میں کوئی اثر نہیں ہوتا، اسی طرح کھیت کٹ جائے تو بالکل ختم ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح بتایا کہ ان لوگوں کو بھی ہم نے کٹے ہوئے کھیت اور بجھی ہوئی آگ کی طرح کر دیا، یعنی وہ لوگ بالکل بے اثر ہو گئے، ان کی کوئی بات نہیں سنی گئی، اس لیے کہ جو وقت سننے کا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔

آسمان وزمین کی تخلیق کا مقصد

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاء وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ☆لَوْ أَرَدْنَا أَن نَّتَّخِذَ لَهْواً لَّاتَّخَذْنَاهُ مِن لَّدُنَّا إِن كُنَّا فَاعِلِينَ﴾

(الأنبياء: ١٦-١٧)

(اور ہم نے آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کو کھیل کے لیے نہیں بنایا، اگر ہم کوئی کھیل کرنا چاہتے تو ہم تفریح کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے)

مشرکین کا عقیدہ تھا کہ دنیا کا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے، اس کا کوئی متعین مقصد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے یہ سارا نظام محض تفریحاً نہیں بنایا ہے، یہ کوئی کھیل نہیں ہے، یہ آسمان بنایا، زمین بنائی اور ان دونوں کے درمیان کی فضا اور ہوا اور یہ ساری چیزیں پیدا کی ہیں، یہ ہم نے کوئی کھیل یا تفریح کا کام نہیں کیا ہے، بلکہ یہ سب بامقصد ہے، یہ تمہارے امتحان کے لیے ہے، اور تمہارا یہاں پیدا کیا جانا، تمہاری عمروں کا ہونا، یہ سب ایک نظام کے مطابق ہے، یہ کوئی تفریح نہیں ہے، نہ ہی ہم نے اس کو کھیل کے طور پر بنایا ہے، اگر ہم کوئی کھیل کرنا چاہتے تو ہم تفریح کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے، محض تفریح کے لیے تم کو پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، لہٰذا ان سب چیزوں کا پیدا کرنا بامقصد ہے، ورنہ اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ یہ دنیا بنائی جاتی اور انسانوں کو پیدا کیا جاتا۔

حق وباطل کا فرق

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ﴾ (الأنبياء: ١٨)

(بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں تو وہ باطل کو کچل دیتا ہے اور تمہارے لیے بدقسمتی ہے اس بات سے جو تم بیان کرتے ہو)

اس آیت میں سنت اللہ کو بتایا جارہا ہے کہ جب حق کے سامنے باطل آجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ پوری قوت کے ساتھ حق کے ذریعہ اس کو کچل دیتے ہیں، مگر اس سے پہلے سمجھا بجھا کر یہ چاہتے ہیں کہ بغیر کچلے ہی باطل ختم ہوجائے، چنانچہ اس کے لیے نبی بھیجتے ہیں، سمجھانے والے بھیجتے ہیں، مختلف طریقوں سے لوگوں کے سامنے یہ واضح کرتے ہیں کہ تم باطل پر ہو، تم غلط کام کررہے ہو اس سے باز آجاؤ، لیکن جب وہ بالکل نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ ان کو کچل دیتے ہیں، اس کے لیے تعبیر استعمال فرمائی کہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں، جیسے وزنی چیز کسی پر ماری جائے تو وہ اس کو توڑ دے گی، اسی طرح حق جو کہ وزنی چیز ہے وہ باطل کو کچل دیتا ہے، جب باطل پر حق کی چوٹ پڑتی ہے تو وہ بالکل ختم ہوجاتا ہے، معلوم ہوا جب سمجھانے بجھانے سے کام نہیں چلتا تو اللہ تعالیٰ طاقت سے کام کردیتے ہیں، جس کے بعد سوائے بربادی اور مصیبت میں مبتلا ہونے کے کچھ نہیں رہ جاتا، اسی لیے فرمایا گیا کہ تمہارے لیے مصیبت اور بدقسمتی ہے اس بات سے جو تم اپنی زبان سے کہتے رہتے ہو اور ہر وقت بیان کرتے ہو، یعنی کبھی تم یہ کہتے ہو کہ اللہ مذاق کررہا ہے، کبھی یہ کہتے ہو کہ اللہ رٹائر ہوگیا ہے، تو یہ جو تم وصف بیان کرتے ہو، یہی تمہارے لیے بدقسمتی ہے، یہی تمہاری تباہی کا باعث ہے، اگر تم توجہ سے سنتے اور اللہ تعالیٰ کی بات مانتے تو تم اس مصیبت تک نہ پہنچتے، لیکن تم نے اس کی باتیں نہیں مانیں، بلکہ اس کا مذاق بنایا تو ہم نے تم کو کچل دیا۔

خدا کی بزرگی

﴿وَلَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِندَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ☆يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ﴾ (الأنبياء: ١٩-٢٠)

(اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اللہ کے پاس ہے (فرشتے) یہ سب وہ ہیں جو اس کی عبادت میں ذرا بھی تکبر نہیں کرتے اور نہ ہی اکتاتے ہیں، وہ رات دن عبادت میں لگے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں ہیں)

آسمان اور زمین سب اللہ کی ملک ہیں، ان میں جو بھی بسے ہوئے ہیں اور جو بھی مخلوقات ہیں وہ سب اللہ کی ہیں، وہ ان کو جیسا چاہے رکھے، یہ سب اسی کی چیزیں ہیں، اسی نے ان کو بنایا ہے، انسان ہو یا جانور؟ زمین ہو یا آسمان؟ یہ سب اللہ کی ملک ہیں، اللہ اپنی چیزوں کو جس طرح چاہے رکھے، اس کو پورا اختیار ہے، اس لیے کہ ان کو اسی نے بنایا ہے، وہ جو چاہے اس کے ساتھ معاملہ کرے، اسی کو اختیار کرے، اسی طرح اس کے علاوہ مخلوقات میں جو اللہ کے پاس ہے یعنی فرشتے اور دوسری مخلوقات جن کو ہم نہیں جانتے، وہ سب بھی اسی کے حکم کے محتاج ہیں، ان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت میں ذرا بھی تکبر نہیں کرتے، ذرا بھی بڑائی نہیں دکھاتے، کیونکہ اللہ کو شرک کے بعد سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز تکبر ہے، شیطان کی جو تباہی ہوئی ہے وہ اسی کبر کی وجہ سے ہوئی، جب اس نے اپنے کو یہ کہا کہ ہم انسان سے بڑے ہیں۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ تمام مخلوقات اللہ کی عبادت میں ہر وقت لگی ہوئی ہیں، وہ اس کی عبادت میں تکبر نہیں کرتیں، اس آیت میں ان مخلوقات کی عبادت کے ضمن میں یہ اشارہ بھی آ گیا ہے کہ انسان کی تباہی بکثرت تکبر کی وجہ سے ہوتی ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ شیطان کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ اس کی جو تباہی ہوئی وہ تکبر کی

www.abulhasanalinadw.org

وجہ سے ہوئی، اس نے یہ کہا کہ کیا ہم انسان کے سامنے جھکیں جس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے، جب کہ ہم آگ سے بنائے گئے ہیں؟ یعنی ہم اس سے برتر ہیں، تو اللہ نے فرمایا کہ تو گستاخی کرتا ہے اور یہاں جنت میں رہتے ہوئے ایسا برا عمل کرتا ہے، لہٰذا تیرا ٹھکانہ یہ جنت نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو تکبر بہت ناپسند ہے کہ کوئی اپنے کو بڑا سمجھے، درحقیقت اللہ تعالیٰ جس کو بڑا بنائے وہ بڑا ہے، لیکن انسان خود اپنے کو کیسے بڑا کہہ سکتا ہے، وہ تو خود کسی کا محتاج ہے، اسی لیے عبادت کرنے میں نمایاں وصف بیان کرتے ہوئے یہی فرمایا گیا کہ انسانوں اور جنوں کے علاوہ جو مخلوقات عبادت کرتی ہیں وہ تکبر سے دور ہیں، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان بہت جلد تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ سمجھتا ہے کہ ہم کسی دوسرے کی بات کیوں مانیں، کیا وہ ہمارا استاد ہے یا باپ ہے؟ ہم جو کر رہے ہیں وہی ٹھیک ہے، آپ کون ہوتے ہیں ہم کو سمجھانے والے، ہم کو توجہ دلانے والے، ہم جو کرتے ہیں وہ ٹھیک ہے، اس کے علاوہ ان مخلوقات کے متعلق یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد جو کام کر دیا ہے وہ اس میں لگی ہیں، کبھی ان کو تھکن محسوس نہیں ہوتی، جب کہ ان کے مقابلہ انسانوں اور جنوں کو اللہ نے اس بات کا موقع دیا ہے کہ وہ اپنے تھکنے کا احساس کرنے لگیں، اپنی بڑائی کا احساس کرنے لگیں، یہ اس لیے دیا ہے تا کہ ان کو احساس ہو سکے کہ اللہ نے جو کہا ہے وہ ماننا ہے، نہ کسی قسم کی بڑائی جتانا ہے، نہ تھکنے کا شکوہ کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود ہی ایسا حکم دیتا ہے جس میں تھکان نہ ہو، لیکن اگر آدمی اللہ کی بات نہ مانے، اور یہ کہے کہ ہم تھک جائیں گے، ہم کمزور ہیں تو یہ پسندیدہ بات نہیں۔

معبودانِ باطل

﴿أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنشِرُونَ﴾(الأنبياء: ٢١)

(کیا انہوں نے ایسے خدا بنا لیے ہیں جوان کو زندہ کر سکتے ہوں)

مشرکین کے متعلق کہا گیا کہ یہ لوگ خدا کے ساتھ کسی کو کیوں شریک کرتے ہیں

اور کیوں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں؟ اس کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرتے ہیں، جب کہ وہ کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے، نہ ہی وہ اس بات پر قادر ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کو دوبارہ زندگی بخش سکیں۔

خدا کی وحدانیت

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ☆لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ﴾

(الأنبياء: ٢٢-٢٣)

(اگر ان (آسمان وزمین) میں کئی خدا ہوتے اللہ کے علاوہ تو زمین و آسمان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا تو پاکی اللہ ہی کے لیے ہے جو کہ عرش عظیم کا رب ہے، اس سے نہیں پوچھا جاسکتا جو وہ کرتا ہے اور ان سے خوب پوچھا جائے گا)

اس آیت میں عقل کو اپیل کرنے والی ایک بات ذکر کی گئی کہ اگر اس نظام عالم کے چلانے والے کئی خدا ہوتے اور وہ سب معبود ہوتے تو ان میں انتظامی اعتبار سے آپس میں کیسے صلح رہ سکتی تھی؟ وہ دونوں لازمی طور پر اپنی اپنی مرضی پر چلتے، جب دونوں اپنی اپنی مرضی پر چلتے تو یقیناً دونوں کی مرضی ٹکراتی، کیونکہ جب دو برابر کے ہوتے ہیں تو ان میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے، البتہ چھوٹے بڑے میں ٹکراؤ نہیں ہوتا، اسی لیے فرمایا کہ یہ لوگوں کو غور کرنے کی بات ہے کہ اگر خدائے وحدہ لاشریک کے علاوہ اس دنیا کو چلانے والے کئی خدا ہوتے تو زمین و آسمان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا، اس لیے کہ دونوں کی مرضی کا ٹکراؤ پیدا ہوتا، لہٰذا جو لوگ مشرکانہ عقائد رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ پاکی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، وہی عرش عظیم کا رب ہے، اور وہ جو کچھ اپنے منھ سے کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے متعلق باتیں بناتے ہیں، اللہ ان سے بلند و برتر ہے، ان کی باتیں بدتمیزی کے سوا کچھ

www.abulhasanalinadw.org

نہیں، انہیں یہ جان لینا چاہیے کہ وہ تنہا رب ہے، اس سے یہ نہیں پوچھا جاسکتا کہ تو کیوں کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے، البتہ ان لوگوں سے خوب پوچھا جائے گا، بلکہ ان سے ہر ہر چیز پوچھی جائے گی۔

اس آیت میں یہ معلوم کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف نسبت کرکے تم لوگ یہ بات کیسے کہتے ہو کہ یہ سب دوسری چیزیں بھی خدا ہیں، کیا اللہ نے زمین میں بہت سے خدا بنائے ہیں، جو تم کو دوبارہ پیدا کرسکتے ہیں؟ فرمایا کہ عقل کی بات سمجھ لو، اگر اس جہان میں کئی خدا ہوتے تو آپس میں ان میں ٹکراؤ ہوتا، زمین وآسمان دونوں میں بگاڑ پیدا ہوجاتا، ایک کہتا کہ زمین اتنی بڑی بنائی جائے، دوسرا کہتا نہیں اس سے چھوٹی بنائی جائے، کیونکہ جب دو برابر کے ہوں گے تو ان میں رائے کا فرق ہوگا، اور پھر ٹکراؤ ہوگا، معلوم ہوا کئی خدا سے نظام نہیں چل سکتا، بلکہ ایک ہی کا نظام چلے گا، ایک ہی کے تحت سب کچھ ہوسکتا ہے، اگر کئی برابر کے ہوں گے تو ضرور اختلاف ہوگا، یہ ایک خدا کے ہونے ہی کی دلیل ہے کہ زمین وآسمان میں سکون ہے اور ہر چیز قاعدہ سے انجام پارہی ہے، لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کریں، کیونکہ وہ ان تمام چیزوں سے بڑا ہے جن کو لوگ اہمیت دیتے ہیں، لوگوں کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ وہ کیا کرتا ہے، کیونکہ وہی سب سے بڑا ہے، البتہ ان سب سے سوال کیا جائے گا کہ انہوں نے کیا کام انجام دیا اور اپنی صلاحیتوں کو کس رخ پر لگایا۔

ناواقفیت کا نقصان

﴿أَمِ اتَّـخَـذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ هَذَا ذِكْرُ مَن مَّعِيَ وَذِكْرُ مَن قَبْلِي بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُم مُّعْرِضُونَ﴾ (الأنبياء: ٢٤)

(کیا انہوں نے اس کو چھوڑ کر ان کو خدا بنالیا ہے، تو آپ ان سے کہیے کہ اس کی کوئی دلیل لاؤ، یہ میرے ساتھ والوں کی (کتاب)

نصیحت (موجود) ہے اور یہ مجھ سے پہلے والوں کی نصیحت (کی
کتابیں) بھی ہیں، لیکن اکثر لوگ وہ ہیں جو واقعہ سے ناواقف ہیں
اور حق بات سے گریز کرتے ہیں)

اللہ تعالیٰ اس میں مشرکین سے ان کی بت پرستی پر دلیل کا مطالبہ کرر ہا ہے کہ جن کو تم نے خدا بنالیا ہے اگر اس کی کوئی دلیل ہو تو بتاؤ، کیسے ان کو تم نے اپنا خدا بنایا ہے، خدا بنانے کا کیا اصول ہے، کس طرح تم نے یہ بات طے کر لی، اس کی کوئی دلیل پیش کرو، فرمایا گیا کہ نبی ﷺ ان سے یہ کہیں کہ جو کچھ میرے سامنے ہورہا ہے اس کے لحاظ سے ہم کو دلیل دو، کیونکہ یہ سب وہ باتیں ہیں جو مجھ سے پہلے بھی ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء آئے ہیں، انہوں نے اسی طرح کی دعوت دی ہے جو میں دے رہا ہوں، اور ان لوگوں نے بھی اسی طرح شرک کی مذمت کی ہے جس طرح میں کررہا ہوں، انہوں نے بھی ایسے ہی دعوت دی ہے جیسے میں دے رہا ہوں، تو میرا یہ تذکرہ اسی طرح کا ہے جیسے پہلے انبیاء کے ذریعہ ہو چکا ہے، بت پرستی پر کسی دلیل کے فراہم نہ ہونے پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ واقعہ سے ناواقف ہیں، اسی لیے وہ حق بات سے گریز کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو چیزیں عطا کیں؛ ایک علم دوسرے ظن، ظن یہ ہے کہ آدمی اندازہ اور حساب لگا کر کسی چیز کی حقیقت کو سمجھے، اور علم یہ ہے کہ آدمی حقیقت کو پوری طرح دیکھ لے، کسی چیز کو بالکل واضح طریقہ سے مان لے، گویا علم کہتے ہیں حقیقت کے جاننے کو، اور ظن کہتے ہیں حقیقت کا اندازہ لگانے کو، واقعہ یہ ہے کہ انسان کی اکثر معلومات ظن پر مبنی ہیں اور تھوڑی معلومات علم پر مبنی ہیں، اسی لیے مذکورہ آیت میں فرمایا گیا کہ یہ لوگ جانتے نہیں، یہ حقائق سے ناواقف ہیں، اسی لیے یہ لوگ اعراض کرتے ہیں، جب نبی ان کو حق بات بتا رہا ہے، تو صحیح بات ان کو ماننا چاہیے، اس کے بعد ان کو اعراض نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی معلومات ظن پر مبنی نہیں ہیں بلکہ علم پر مبنی ہیں۔

ظالمین کا انجام

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيٓ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ☆وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ☆لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ☆يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ☆وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ﴾(الأنبياء: ۲۵-۲۹)

(ہم نے اس سے پہلے جو بھی رسول بھیجا اس کو اسی بات کی وحی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، بس میری ہی عبادت کرو، اور وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا تجویز کرلیا، اس کی ذات پاک ہے، البتہ یہ لوگ اللہ کے مکرم ومحترم بندے ہیں، وہ اپنی بات میں اللہ تعالیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکتے، اور وہ اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور پیچھے ہے، یہ صرف انہیں کی سفارش کرسکتے ہیں جن کے لیے اللہ کی رضا حاصل ہو، (اور ان کا حال یہ ہے کہ) یہ اللہ کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، اور اگر ان میں سے کوئی یہ دعوی کرے کہ میں خدا ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے اور ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں زیادتی کرنے والوں کو)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول پر یہی ذمہ داری ڈالی اور اس کو اس بات کی وحی وتلقین کی کہ وہ جاکر کہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میری عبادت کرو، مذکوہ آیت میں بتایا گیا کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے بیٹے قرار دیئے ہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اہل کتاب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کے درجے تک پہنچا

دیا تھا، ان کے متعلق فرمایا گیا کہ یہ نیک لوگ ضرور ہیں، لیکن یہ خدا نہیں ہیں، بلکہ یہ ہمارے بندے ہیں البتہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مکرم ومحترم بنایا ہے، فرمایا گیا کہ ان کا حال یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکتے، یعنی اس کے سامنے اپنی بات نہیں چلا سکتے، بلکہ جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے یہ وہی کریں گے، اس کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ بغیر خدا کی مرضی کے کسی کی سفارش بھی نہیں کرسکتے، یہ سفارش صرف ان لوگوں کی کرسکتے ہیں جن کے لیے اللہ کی رضا ہو، اللہ جن کے لیے سفارش کرنے کی اجازت دے گا، یہ انہیں کی سفارش کرسکتے ہیں، گویا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ تک پہنچادیں گے تو اس آیت سے ان کا یہ عقیدہ کھوکھلا ہوگیا، کیونکہ یہ لوگ بغیر اس کی مرضی کے سفارش نہیں کرسکتے، یہ صرف اللہ کی مرضی اور اس کی اجازت ہی سے سفارش کرسکتے ہیں، ان کی مزید وصف بیانی کرتے ہوئے بتایا کہ یہ باوجود معزز و محترم ہونے کے اللہ کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں اللہ ناراض نہ ہوجائے، تو بھلا یہ کیسے خدا ہوسکتے ہیں، اور کیسے اللہ کے برابر ہوسکتے ہیں، علاوہ ازیں اگر ان میں سے کوئی یہ دعوی کرے کہ میں خدا ہوں، تو یہ بات واضح رہے کہ ہم اس کو جہنم پہنچادیں گے، چاہے وہ کتنا ہی معزز ہو، کتنا ہی نیک ہو، لیکن اگر وہ اپنے کو خدا کہتا ہے تو ہم اس کو جہنم پہنچادیں گے، یہ خدائی قانون ہے کہ ہم زیادتی کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

دعوت فکر

﴿أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ﴾

(الأنبياء: ۳۰)

(کیا غور نہیں کرتے وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا کہ آسمان وزمین آپس میں جڑے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو الگ الگ کیا، اور ہر زندگی رکھنے

والی چیز ہم نے پانی سے بنائی، کیا یہ لوگ ایمان نہیں رکھتے)

علم ہیئت اور اسلام کا نظریہ

جو لوگ آسمان و زمین اور اس کے اندر کی چیزوں پر غور کرتے ہیں، ان کے اس غور کرنے کو "علم ہیئت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ علم اسلام کے سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہے، لیکن اگر اس کے اندر اسلامی روشنی نہ ہو تو بسا اوقات آدمی بہک بھی جاتا ہے، جیسے دنیا کب پیدا ہوئی، آسمان و زمین کیا چیز ہے، اگر ان چیزوں پر بغیر اسلامی روشنی کے غور کیا گیا تو یقیناً انسان بھٹک جائے گا، یہ وہ چیزیں ہیں جن پر صدیوں اور ہزاروں سال سے غور ہوتا رہا ہے، غور کرنے والے وہ لوگ تھے جن کا اللہ پر ایمان پر نہیں تھا، اس لیے وہ اس کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے، اور کسی چیز کو سمجھنے کے دو ہی ذریعہ ہوتے ہیں؛ ایک عقل اور دوسرے مشاہدہ، آدمی کو جو چیز نظر آتی ہے اس کا علم اس کو حاصل ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ غور و فکر سے معلومات حاصل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں دونوں پہلو موجود ہیں، یعنی مشاہدہ والا پہلو بھی ہے اور وہ پہلو بھی ہے جو غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے، مشاہدہ تو یہ ہے کہ ہم آسمان کو دیکھتے ہیں، زمین، چاند و سورج کو دیکھتے ہیں، ان کی رفتار کو دیکھتے ہیں، زمین سے جو چیزیں اگتی ہیں ان سب کو دیکھتے ہیں، غرض کہ مشاہدہ میں اللہ تعالیٰ نے اتنی چیزیں رکھی ہیں کہ ان کو دیکھ کر آدمی اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ یہ تسلیم کرے کہ ان کا بنانے والا کوئی ایک ہے، یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہو سکتی ہیں، کیونکہ کوئی چیز خود بخود نہیں بنتی، بلکہ کسی کے بنانے ہی سے بنتی ہے، بنانے کے لیے مادہ بھی ہونا چاہیے جس سے بنائی جائے اور بنانے والا بھی ہونا چاہیے، ورنہ ایک دم سے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی، تو اس چکر میں لوگ رہتے ہیں کہ یہ معلوم کریں کہ یہ دنیا کیسے بنی ہے، اگر یہ خود بخود بنی ہے تو کیسے خود بخود بن گئی، خود بخود بننا بھی خود ان غور کرنے والوں کے عقل میں بھی زیادہ نہیں آتا، چنانچہ وہ پریشان ہوتے ہیں، اور ادھر ادھر کی باتیں نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ مشاہدہ

www.abulhasanalinadw.org

خود بتا رہا ہے کہ اس سارے نظام کو کسی نے بنایا ہے، اور یہ سارا نظام وجود میں آنے کے بعد جس طرح بہت ہی مرتب طریقہ سے چل رہا ہے، ذرا بھی اس میں فرق نہیں ہے، تو اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ کوئی اس کو چلا رہا ہے، گویا کسی ذات نے صرف بنایا ہی نہیں ہے بلکہ اس کو چلا بھی رہا ہے، ورنہ یہ بالکل ایک رفتار سے اور ایک ہی ضابطہ میں کیسے چل رہا ہے کہ اس میں فرق ہی واقع نہیں ہوتا، مثلاً: درخت ہے، جو جس پھل کا درخت ہے وہ اپنی خصوصیات رکھتا ہے، یہ نہیں کہ آم کبھی امرود بن جائے، یا امرود آم بن جائے، بلکہ آم کا پودا آم ہی پیدا کرے گا، امرود کا پودا امرود ہی پیدا کرے گا، یہ انسان کا مشاہدہ ہے، یہ یوں ہی نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو اس میں اونچ نیچ ہوتی، گویا مشاہدہ خود بتاتا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے بنائی ہیں، اور بنا کر وہ اس کو چلا بھی رہا ہے، اور وہ بنانے والی تنہا ایک ہی ذات ہے، اس لیے کہ اگر کئی ہوں گے تو اس میں تنوع ہوجاتا ہے، اور آپس میں ٹکراؤ ہوجاتا، ایک کی کچھ رائے ہوتی ہے، دوسرے کی کچھ ہوتی ہے اور چیزوں میں فرق ہوجاتا ہے اور ٹکراؤ ہوجاتا، پھر یہ طے کرنا مشکل رہے کہ سورج کتنے فاصلے پر ہو، چاند کتنے فاصلے پر ہو، ان کی کیا رفتار ہو، اسی لیے اس نظام میں کوئی شریک نہیں ہے، بلکہ یہ سب چیزیں تنہا اللہ تعالیٰ نے مقرر کیں ہیں، یہ مقرر کیے بغیر نہیں ہوسکتا تھا کہ صدیوں گذر جائیں اور سورج و چاند کی رفتار میں ایک منٹ کا بھی فرق واقع نہ ہو، واقعہ یہ ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جو رفتار ان کی دیکھی گئی تھی وہی رفتار اس وقت بھی ہے، اس کا فاصلہ زمین سے جتنا تھا اتنا ہی ہے، ذرا بھی یہ گھٹے بڑھے نہیں ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ سورج کو ایسا معتدل اور مناسب رکھا ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی فرق ہوجائے تو انسانی آبادی ختم ہوجائے گی، وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ سورج زمین سے جتنے فاصلے پر ہے، اگر اس کا فاصلہ بڑھ جائے تو زمین پر آبادی زندہ نہیں رہ سکتی، اسی طرح اگر فاصلہ کم ہوجائے تو اس کی تمازت اتنی ہوگی کہ لوگ اس میں مرنا شروع ہوجائیں گے اور اگر فاصلہ زیادہ ہوجائے تو اس کی

www.abulhasanalinadw.org

حرارت اتنی کم ہوجائے گی کہ زمین کا جو نظام ہے، یعنی پودوں کا پیدا ہونا، کھیتی وغیرہ کا ہونا اس سب میں سورج کا بہت دخل ہے، زمین میں جو بھی پیداوار ہوتی ہے اس میں پانی اور سورج کا خاص کردار ہے، سورج کی گرمی اور پانی دونوں مل کر پودوں کو ترقی دیتے ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو ساری زمین بالکل خشک ہوکر ختم ہوجائے گی، اور کچھ پیدا نہیں ہوگا، اسی طرح اگر ان میں فرق واقع ہوجائے تو موسم میں اتنی تبدیلی ہوجائے گی کہ لوگ برداشت نہیں کرسکیں گے۔

ان سب چیزوں کا مشاہدہ خود یہ بتا رہا ہے کہ ان سب کا پیدا کرنے والا کوئی ہے اور وہ ایک ذات ہے، اور وہ صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ اس نظام کو برابر چلا رہا ہے، اگر ایسا ہوتا کہ نظام چلنے کا نہ ہوتا، سورج ٹھہرا رہتا، تو آپ کہہ سکتے تھے کہ اس کو بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ برابر اللہ تعالیٰ اس نظام کی رفتار اسی حساب سے چلا رہا ہے اور وہ چل رہا ہے(۱) اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اصلاً زمین وآسمان آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، اور ان کی جو خصوصیات ہیں وہ ظاہر نہیں ہو رہی تھیں، لیکن ہم نے ان کو الگ الگ کیا، تاکہ ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ پر کام کرے، کیونکہ جب یہ سب جڑے ہوئے تھے تو کوئی اپنا کام پورا نہیں کرسکتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو علاحدہ علاحدہ کردیا، یعنی ان کو ان کی اپنی جگہ پر لگادیا، جو ان کی ڈیوٹی تھی اس پر ان کو مامور کردیا، الگ کرنے کا یہی مطلب ہے کہ زمین اپنا کام کرے اور آسمان اپنے کام میں لگ جائے۔

(۱) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو عدم سے وجود بخشا، اس لیے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو پہلے سے موجود تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وجود بخشا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اس کے آغاز کا کوئی مطلب نہیں، باقی چیزیں سب اللہ نے بنائی ہیں وہ جب اللہ نے بنائی ہیں تو بن گئیں، اللہ تعالیٰ کے پاس وہ طاقت ہے کہ اللہ جس کا ارادہ کرلے، تو وہ ارادہ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

www.abulhasanalinadw.org

پانی کی اہمیت

اس کے بعد مشاہدہ کی ایک بات یہ بتائی کہ دنیا میں جتنی بھی زندگی والی چیزیں لوگوں کے مشاہدہ میں آتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو پانی سے بنایا ہے، ہر چیز کا وجود پانی سے ہوا ہے، یعنی سارے جانور اور سارے انسان، غرض کہ جتنے ذی حیات ہیں وہ سب پانی سے باحیات ہیں، حتی کہ نباتات اور درخت بھی سب پانی سے ہی پیدا ہوئے ہیں، ان کی اصل پانی ہی ہے، حتی کہ انسان کی اصل بھی پانی ہے، ماں کے پیٹ میں باپ کے ذریعہ سے پانی ہی سے اس کی شروعات ہوتی ہے، جس کو نطفہ کہتے ہیں، مشاہدہ کی ان چیزوں پر غور کرنے کے بعد فرمایا کہ کیا یہ ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد بھی ہم پر ایمان نہیں لاتے، ایمان کا مطلب ہے: کسی چیز کا دل سے ماننا، یعنی یہ چیزیں تو ہر انسان کے مشاہدہ میں آرہی ہیں، ہر انسان اپنی آنکھوں سے خود دیکھ رہا ہے، تو پھر اس کو نہ ماننے کا کیا مطلب ہے؟

پہاڑ ایک نعمت

﴿وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجاً سُبُلاً لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ﴾ (الأنبياء: ۳۱)

(اور ہم نے پہاڑوں کو زمین پر جما دیا ہے تاکہ زمین ڈول نہ جائے، اور ہم نے پہاڑوں میں گھاٹیاں بنادی ہیں تاکہ وہ راستہ پاسکیں)

اللہ تعالیٰ نے مشاہدہ کرنے کے متعلق دوسری دلیل دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے زمین کے اوپر وہ چیزیں گاڑ دی ہیں جو جم جائیں، یعنی ایسے پہاڑ زمین پر رکھ دیئے ہیں جن سے زمین جام ہوجائے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ عمل حکمت سے خالی نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایسا یوں ہی کردیا، بلکہ اس کی ہر ہر چیز کے اندر مصلحت وحکمت اور مقصد ہے، اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بھی بنائی ہیں، وہ سب کام کے لیے ہیں، تفریح کے لیے نہیں ہیں، لہٰذا پہاڑ جو زمین پر رکھے گئے ہیں، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے

www.abulhasanalinadw.org

زمین پر پہاڑ اس لیے رکھے ہیں کہ زمین ڈول نہ جائے، گویا زمین پر پہاڑ اس لیے جمائے ہیں تا کہ اس کا توازن برقرار رہے، پہاڑوں کا اس پر جگہ جگہ بوجھ رہے، زمین کے جو مختلف اجزاء ہیں، کہیں سمندر ہیں، کہیں پر خشکی ہے، کہیں پر مسطح زمین ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان میں ان پہاڑوں سے توازن قائم رکھا ہے، پہاڑ اس جگہ پر بوجھ بنتے ہیں جہاں سے زمین کے بھٹکنے اور اس کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کا مسئلہ ہو، اور اگر خدا کی طرف سے ایسا نہ ہوتا تو زمین ایک طرف جھک جاتی، جھک جانے سے پھر اس کی رفتار پر اور ہر چیز پر اثر پڑتا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی رفتار اور اس کا جو کام ہے اس لحاظ سے اس کے اوپر جگہ جگہ پہاڑ ڈال دیئے ہیں، جو اس کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں، اور ان پہاڑوں میں گھاٹیاں اور راستے بنا دیئے ہیں، ورنہ پہاڑ بیچ میں دیوار کی طرح کھڑے ہو جاتے، جن کی وجہ سے آدمی ادھر سے گذر ہی نہیں سکتا تھا، لیکن ان راستوں کی وجہ سے ہر انسان پہاڑوں پر ہو کر جا سکتا ہے، ان پہاڑوں میں درّے ہوتے ہیں، گھاٹیاں اور راستے ہوتے ہیں، اس حکمت عملی کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے لوگ راہ پائیں، یعنی اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکیں، لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوگا، مختلف اطراف میں جانا ہوگا، تو اگر یہ پہاڑ دیوار بن جاتے تو وہ راستے بند ہو جاتے اور اس وجہ سے دوسرے علاقے الگ ہو جاتے اور یہ الگ ہو جاتے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام بھی کیا کہ پہاڑوں کو اگر چہ زمین پر قابو رکھنے کے لیے جما دیا ہے، لیکن ان کو دیوار نہیں بننے دیا، بلکہ اس میں کٹاؤ رکھے، وہ بالکل سیدھے سیدھے نہیں ہیں، بلکہ کہیں اونچے ہیں کہیں نیچے ہیں، کہیں گھاٹیاں ہیں، کہیں مسطح ہیں۔

آسمان ایک محفوظ چھت

﴿وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفاً مَّحْفُوظاً وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ﴾ (الأنبياء: ٣٢)

(اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا لیکن یہ لوگ ان کھلی نشانیوں کے بعد بھی اعراض کرتے ہیں)

www.abulhasanalinadw.org

آسمان وزمین کی تخلیق اورزمین پر پہاڑوں کے رکھنے کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ بھی غورکرنے کا مقام ہے کہ ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت کی حیثیت دی ہے، آسمان زمین پر چھت کی طرح سایہ فگن ہے، لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی ان کھلی ہوئی نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں، یعنی ان کو نظرانداز کرتے ہیں، جب کہ یہ سب چیزیں اس بات کی علامات ہیں کہ اس کے ذریعہ آدمی اللہ تعالیٰ کی معرفت تک پہنچ سکتا ہے، جو چیزیں نظر آرہی ہیں وہ خود بتارہی ہیں کہ ان کا بنانے والا کوئی ہے، جس نے بہت ہی مناسب اور ایک مقصد کے مطابق ان کو بنایا ہے، اور پھر ان سب کو چلا بھی رہا ہے، لیکن افسوس کہ یہ لوگ اس کے بعد بھی اعراض کرتے ہیں۔

قمری اور شمسی نظام

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَسْبَحُوْنَ﴾ (الأنبیاء: ۳۳)

(اور وہی ہے جس نے رات ودن بنایا، سورج چاند کو بنایا اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں چکر لگا رہا ہے)

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے دن بھی بنایا اور رات بھی بنائی، سورج بھی بنایا اور چاند بھی بنایا، اور ہر ایک اپنے دائرہ کے اندر رواں دواں ہے، ہر ایک تیر رہا ہے، جیسے پانی میں کوئی چیز تیرتی ہے، اسی طرح فضا میں یہ چانداورسورج تیر رہے ہیں، یعنی اس میں برابر یہ گردش کررہے ہیں، اور رات و دن اپنے اسی نظام کے مطابق آجارہے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ہزاروں سال میں رات کا وقت بڑھ جائے یا دن کا وقت بڑھ جائے، بلکہ جتنا وقت اللہ نے رات کے لیے رکھا ہے اور جتنا وقت دن کے لیے مقرر کررکھا ہے، اسی طرح ہزاروں سال سے وہ اپنی حالت پر باقی ہے، اس میں ایک منٹ کا بھی فرق نہیں ہے، اور ان سیاروں میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں چکر لگا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے جو دائرے بنائے ہیں وہ ہر ایک کے الگ الگ ہیں، چاند کا دائرہ الگ ہے، سورج کا دائرہ الگ

ہے، اگر یہ دائرے بدل جائیں تو پورا نظام چوپٹ ہوجائے گا، ظاہر ہے کہ قمری اور شمسی سال میں گیارہ روز کا تقریباً فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق ایک حساب سے ہوتا ہے، اس سے جاڑے گرمی کا نظام الگ بنتا ہے اور دوسرا نظام جو عبادات کا نظام ہے وہ الگ بنتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا نظام الگ رکھا ہے۔

انسانی کمزوری

﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ﴾ (الأنبياء: ٣٤)

(اور ہم نے کسی انسان کے لیے تم سے پہلے ہمیشہ رہنے کا نظام نہیں رکھا تو کیا ایسا ہے کہ آپ کا انتقال ہوجائے اور یہ سب ہمیشہ رہیں)

آدمی کی کمزوری یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، کسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہمیشہ کی زندگی نہیں رکھی ہے، ایسا نہیں ہے کہ نہ یہ دنیا ختم ہو اور نہ آدمی مرے، بلکہ سب کو ایک متعین مدت پوری کر کے اس دنیا سے جانا ہے، اور وہ مدت ہر ایک کی اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہے، اسی لیے اس آیت میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کے لیے ہمیشہ رہنے کا نظام نہیں رکھا، لہٰذا جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بات نہیں مان رہے ہیں اور دعوت دیتے چلے جارہے ہیں، ہم ان کو مار بھی نہیں سکتے البتہ جو تکلیف پہنچانے کا نظام ہے وہ پہنچا رہے ہیں، لیکن آپ کی دعوت ختم نہیں ہو رہی، تو کچھ دن انتظار کرلیں، پھر جب ان کا انتقال ہوجائے گا، اس کے بعد ہمیں چھٹی مل جائے گی، چنانچہ ان کے اسی خیال کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا بھی تو انتقال ہوجائے گا، یعنی اگر یہ زندہ نہیں رہیں گے تو تم بھی تو زندہ نہیں رہو گے، لہٰذا یہ سوچنا کہ یہ ختم ہوجائیں گے، اور ہمیں عافیت حاصل ہوجائے گی بے کار ہے، کیونکہ ایسا کوئی قانون نہیں کہ نبی کا انتقال ہوجائے اور یہ سب ہمیشہ زندہ رہیں، اس لیے کسی کا بھی یہ خیال کرنا کہ کسی کے انتقال سے دعوت کا کام ختم ہوجائے گا غلط خیال ہے، حقیقت یہ ہے کہ انتقال ان کا بھی ہوگا اور نبی کا بھی ہوگا۔

موت وزندگی کا نظام

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ﴾ (الأنبياء: ٣٥)

(ہر شخص کو موت کا مزا چکھنا ہے اور ہم تم کو آزمانا چاہتے ہیں شر وخیر سے اور تم سب ہمارے پاس لوٹ کر آؤ گے)

خدائی قانون یہ ہے کہ ہر شخص کو موت کا مزا چکھنا ہے، جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اس کو موت کے مرحلہ سے گذرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے موت وزندگی کا نظام اس لیے رکھا ہے کہ انسانوں کو آزما سکے، اسی لیے فرمایا گیا کہ ہم انسانوں کو تکلیف اور شر وخیر سے آزماتے ہیں، یعنی تم انسانوں کو صرف زندگی نہیں دے رہے ہیں، بلکہ جب زندگی دے رہے ہیں تو اس میں تم کو مختلف حالات سے بھی گذرنا پڑے گا، انہیں حالات سے تمہاری آزمائش ہوگی، تم کو مصیبتیں بھی پیش آئیں گی، راحتیں بھی پیش آئیں گی، تم کو پسندیدہ باتیں بھی پیش آئیں گی، ناپسندیدہ باتیں بھی پیش آئیں گی، اور فرمایا گیا کہ یہی چیز ہم دیکھنا چاہتے ہیں، ہم نے جو تم کو زندگی ہے یہ اسی مقصد سے دی ہے کہ تم کو جانچیں، تاکہ تمہاری جو خواہشات ہیں، تمہارا جو مزاج ہے، تمہارے جو مقاصد ہیں وہ چھپے نہ رہیں، بلکہ وہ سب ہمارے سامنے آجائیں، اور یہ چیزیں سامنے جبھی آسکتی ہیں جب انسان پر ذمہ داری ڈالی جائے، تبھی یہ پتہ چلے گا کہ آدمی اس کو پورا کرسکتا ہے یا نہیں، اگر ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تو انسان کی صلاحیت کا پتہ نہیں چلے گا، یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی کی ذہانت کا پتہ کرنا ہو کہ وہ کتنا ذہین ہے، تو آپ اس کے سامنے کوئی مسئلہ رکھئے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرسکتا ہے یا نہیں، لہٰذا جیسا وہ حل کرے گا اسی حساب سے اس کی ذہانت کا پتہ چلے گا، کوئی کام اس کے سپرد کیجئے جب وہ اس کام کو کرے گا تبھی اس کے متعلق پتہ چلے گا کہ یہ کام کرنے میں کتنا کامیاب اور ناکام ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف طریقوں سے آزمایا، اور فرمایا کہ ہم تم کو شر وخیر دونوں سے آزماتے ہیں، اور آزمانے کا مقصد یہی ہے کہ تمہاری صلاحیتوں کا علم ہوسکے۔

www.abulhasanalinadw.org

اس کے بعد فرمایا کہ اس دنیوی زندگی کے بعد تم سب ہمارے پاس ہی لوٹ کر آؤ گے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ تم کو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے آزمانے کے واسطہ تکلیف و آرام میں رکھا اور اس کے بعد تم ختم ہو گئے، بلکہ فرمایا کہ تم سب ہمارے پاس اپنا حساب لے کر آؤ گے، اس دن معلوم ہوگا کہ تم نے شر کے موقع پر کیا کیا ہے اور خیر کے موقع پر کیا کیا ہے، اس دنیا میں تم کو شر کے حالات بھی پیش آئے ہیں اور خیر کے حالات بھی پیش آئے ہیں، اس میں تمہارا رویہ کیا رہا ہے، تم نے شر کو کس طرح دور کیا ہے، شر سے تمہارا کیا معاملہ ہوا ہے اور خیر سے کیا معاملہ رہا ہے۔

رحمان کے منکر

﴿وَإِذَا رَآكَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُواً أَهَذَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ وَهُم بِذِكْرِ الرَّحْمَنِ هُمْ كَافِرُونَ﴾(الأنبياء: ٣٦)

(اور یہ کفر کرنے والے جب بھی آپ کو دیکھتے ہیں تو یہ آپ کا مذاق بناتے ہیں، (اور کہتے ہیں) کیا یہی ہے وہ آدمی جو تمہارے خداؤں کا ذکر کرتا ہے، حالانکہ وہ خود رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں)

مشرکین کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ سارے حقائق ان کے سامنے ہیں، اس کے بعد بھی یہ اعراض کرتے ہیں اور زندگی کو انہوں نے ایک تحفہ یا ایک تفریح کی چیز سمجھ رکھا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ زندگی ان کو آزمانے کے لیے ہے، تاکہ یہ پتہ چلے کہ کون انسان کتنا گہرا ہے، کتنا وہ لائق ہے اور کتنا نالائق ہے، اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی دی ہے، اور زندگی کی جو مقدار ہے اور زندگی کی جو مدت ہے اس کو بھی اسی حساب سے اللہ نے متعین کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ آدمی کیسا ہے، کس مقصد کا ہے، اپنی خواہش پر کتنا چلتا ہے اور اپنے خالق و مالک کی بات پر کتنا چلتا ہے۔

مشرکین کے متعلق بیان کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ ماننا تو بڑی بات ہے، یہ آپ ﷺ کو پریشان کرتے ہیں، جب بھی کفار آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مزاق

بناتے ہیں، آپ کو چڑھاتے ہیں، بجائے اس کے کہ بات کو سنیں اور مانیں، آپس میں یوں کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ آدمی ہے جو تمہارے خداؤں کو برا بھلا کہتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہی کفار اپنے اصل خدا کا انکار کرنے والے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے رحمٰن کا لفظ استعمال کیا ہے، کیونکہ عرب اس لفظ سے بطور خاص چڑھتے تھے، اس لیے کہ رحمان کے بہت خصوصی معنی ہیں، مشرکین نبی ﷺ سے کہتے تھے کہ تم رحمان کے لفظ کو کیوں استعمال کرتے ہو، ایسا نہ کیا کرو، اسی لیے قرآن مجید میں ان کے اوپر طنز کستے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں۔

انسانی مزاج

﴿خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ☆ وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾

(الأنبياء: ٣٧-٣٨)

(انسان کو عجلت کے مزاج کا بنایا گیا ہے، میں تم کو جلد ہی اپنی نشانیاں دکھاؤں گا بس تم جلدی مت کرو، اور وہ کہتے ہیں آپ کا وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو)

یعنی کفار عجلت پسندی میں یہ کہتے ہیں کہ اے نبی (ﷺ)! آپ کا وعدہ کب پورا ہوگا، آپ جو ہم سے کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے تو عذاب آئے گا، قیامت آئے گی، تو اگر آپ سچے ہیں تو یہ بتائیے کہ آپ کا یہ وعدہ کب پورا ہوگا، یا آپ صرف وعدے ہی کرتے رہتے ہیں حقیقت کچھ نہیں ہے۔

انسان کے مزاج میں عجلت ہوتی ہے، وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز جلدی ہو جائے، جو چیز اس کو مطلوب ہوتی ہے اور اس کو جس چیز کا انتظار ہوتا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ فوراً یہ کام جلدی سے ہو جائے، اسی کے متعلق کہا گیا کہ انسان کا مزاج جلدی کرنے کا ہے، عذاب کے متعلق ان کو اتنی جلدی رہتی ہے کہ ہر وقت نبی سے کہتے ہیں کہ عذاب لے آؤ، اللہ

www.abulhasanalinadw.org

تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تم کو ضرور اپنی نشانیاں دکھا دیں گے بس تم جلدی مت کرو، ایک مدت بعد تم خود اچھی طرح دیکھ لوگے اور بات کو سمجھ جاؤگے، ابھی ہوسکتا ہے کہ عجلت میں تم کچھ بات نہ سمجھتے ہو، لہٰذا عجلت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہماری اہم بات پر غور کرو۔

عذاب کی تشریح

﴿لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ☆بَلْ تَأْتِيْهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْن﴾ (الأنبياء: ۳۹-۴۰)

(کاش! یہ لوگ جان لیتے جنھوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے، جب یہ اپنے چہروں اور اپنی پیٹھ سے آگ کو ہٹا نہ سکیں گے اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کرنے والا ہوگا، بلکہ وہ ان پر اچانک آئے گی (قیامت) تو وہ اس کو ہٹا نہیں سکیں گے اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی)

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ جو لوگ جلد عذاب آنے کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کے متعلق ان کو علم نہیں ہے، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کوئی تفریح یا کھیل نہیں ہے، یہ سمجھ لو کہ تم جس چیز کا مطالبہ کررہے ہو، اور اس سے تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ یہ نبی سچ کہہ رہے ہیں یا غلط، جب اس چیز میں تم مبتلا ہوگے تو تمہاری ایسی حالت ہوگی کہ اگر تم اس حالت کے متعلق جان لیتے تو اس کا کبھی دوبارہ سوال نہ کرتے، وہ وقت ایسا ہوگا کہ جب تم اپنے چہروں سے آگ کو ہٹا نہ سکوگے، جہنم کی آگ تمہارے چہروں کی طرف بھرپور طریقہ سے آئے گی، وہ آگ صرف چہروں پر ہی نہیں بلکہ پیٹھ پر بھی حملہ آور ہوگی، غرض کہ وہ وقت ہی ایسا ہوگا کہ انکار کرنے والوں کا کوئی مدد بھی کرنے والا نہ ہوگا، اور نہ ہی خدا کی طرف سے ان کی مدد ہوگی، اور ایسا تو ہے ہی نہیں کہ خدا کے علاوہ کوئی دوسرا ان کی مدد کردے اور آگ کو ان سے ہٹادے، اور عذاب سے بچادے، بس جب اچانک ان پر مصیبت آئے گی تو اس دن یہ سب مبہوت رہ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے قیامت یا مؤخذاہ کے دن کو مبہم رکھا ہے، وہ وقت اچانک آئے گا، جس کا آدمی کو اندازہ بھی نہیں ہوگا، جب وہ گھڑی آئے گی تو ایک دم سارے مجرمین گھبرا جائیں گے، جیسے کوئی بڑا واقعہ ایک دم بلا توقع پیش آجائے، اس سے آدمی مبہوت و بدحواس ہوجاتا ہے، اسی طرح قیامت بلا توقع و بلا اندازہ اچانک آئے گی اور ان کو مبہوت کردے گی۔

جس عذاب میں وہ گرفتار ہوں گے، وہ اس دن اس کو ہٹانے سے استطاعت نہیں رکھیں گے، ان کے پاس سوائے برداشت کرنے اور بھگتنے کے کوئی حل نہ ہوگا، اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ گرفت کے وقت ایک دو دن ٹھہر جائیں، بلکہ وہ اچانک آئے گی، ایسا کوئی نہ ہوگا جو آگ کی لپٹوں اور اس کے حملوں کو روک سکے، اور اس دن ایسا بھی نہ ہوگا کہ ظالمین کو مہلت دی جائے۔

استہزاء کا نتیجہ

﴿وَلَقَدِ اسْتُهْزِءَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾ (الأنبياء: ٤١)

(اور آپ سے پہلے بھی جو رسول آئے ہیں ان کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے مذاق بنایا تھا ان کو عذاب نے گھیر لیا، ان چیزوں کے نتیجہ میں جو وہ مذاق کرتے تھے)

نبی اکرم ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے، اللہ کے پیغمبر آئے ہیں اور ان کی قوموں نے ان کا مذاق بنایا ہے، پھر ان کا انجام یہ ہوا کہ جب بات حد سے تجاوز کرگئی تو ان پر ان کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں اللہ کا عذاب آیا، کیونکہ وہ نبی کے ساتھ مذاق کرتے تھے، ان کو تفریح کا سامان سمجھتے تھے، لیکن ان لوگوں کو اس وقت اندازہ نہ تھا کہ ہم کس چیز کا مذاق اڑا رہے ہیں، نہ ہی ان کو یہ معلوم تھا کہ جب وہ چیز پیش آئے گی تو سوائے افسوس اور مبہوت رہنے کے کوئی نتیجہ نہ ہوگا، اور ان کو وہ چیز بری

طرح گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

خدا کا نظام حفاظت

﴿قُلْ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمَٰنِ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُعْرِضُونَ﴾ (الأنبياء: ٤٢)

(اے نبی کہہ دیجئے کہ تم کو دن و رات میں مشکلات سے کون محفوظ رکھتا ہے رحمٰن کے علاوہ، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرتے ہیں)

اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعہ مشرکین سے یہ سوال کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر ایسا کون ہے جو تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم کو مصائب و مشکلات اور پریشانیوں سے بچاتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ یہاں ہر انسان کو اس بات کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ یہ زندگی کلفتوں اور پریشانیوں اور خطرات کی زندگی ہے، اگر کوئی آدمی اس زندگی پر غور کرے تو یہ زندگی ہر وقت خطرات میں گھری ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد کی وجہ سے امن کے ساتھ کام ہو رہا ہے، اور سلامتی کے ساتھ لوگ زندگی گذار رہے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی زندگی میں یہ معاملہ کیا ہے کہ مومن ہو یا کافر ہو دونوں کو سہولتیں ملیں گی، اللہ تعالیٰ ان دونوں کو وہ ساری چیزیں دے گا جن کی دنیا میں ضرورت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سارا نظام سکون کے ساتھ چل رہا ہے، ورنہ اگر غور کیا جائے تو ایک ایک چیز خطرہ کی ہے، یوں بھی ہم اور آپ دیکھتے ہیں کہ سڑکوں پر چلنا خطرہ سے خالی نہیں، دریاؤں میں نہانا خطرہ ہے، راتوں میں چلنا خطرہ ہے، غرض کہ کتنے ایسے خطرات ہیں جن سے انسان ہر وقت گھرا ہوا ہے، ممکن ہے کہ کہیں کسی کے بستر کے پاس رات میں سانپ نکل آئے، اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کہیں سانپ نہیں نکل سکتا، اسی طرح سڑک پر حادثہ ہو جائے تو کیا گارنٹی ہے کہ حادثہ نہ ہو، جب کہ گاڑیاں اس طرح مل کر نکلتی ہیں کہ اگر ذرا بھی ڈرائیور کا دماغ بہک جائے تو پوری گاڑی صاف ہو جائے، اسی طرح کتنے ایسے مواقع

www.abulhasanalinadw.org

ہوتے ہیں جہاں آدمی کا پیر پھسل سکتا ہے، اور اگر پیر ذرا سا بھی ٹیڑھا ہو جاتا ہے تو آدمی گر جاتا ہے، اور گرنے میں بعض مرتبہ ایسی چوٹ لگتی ہے کہ وہیں حادثہ ہو جاتا ہے، کتنے حادثے ایسے ہیں جو صرف گرنے سے ہو گئے، تو اگر آپ خطرات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ زندگی خطرات سے بالکل بھری ہوئی ہے، قدم قدم پر خطرہ ہے، لیکن لوگ امن کے ساتھ کیوں رہ رہے ہیں؟ کون ہے جو ان کی حفاظت کرتا ہے، یا پھر انسان خود اس لائق بن گیا ہے کہ وہ اپنی حفاظت کر سکے؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ انسان کتنے ہی انتظامات کرے، تب بھی وہ خطرے سے باہر نہیں ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ معلوم کیا کہ اے نبی! ان سے پوچھو کہ تمہیں جو راحت مل رہی ہے، تمہاری جو حفاظت ہو رہی ہے، یہ کون کرتا ہے؟ تم رحمان یعنی اللہ کے مخالف ہو، رحمان کے لفظ کے حوالہ سے تم مخالفت کرتے ہو، تو پھر کون تمہاری حفاظت کرتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ یہ ہر چیز کو سوچتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو نہیں سوچتے کہ وہی ساری کائنات کا نظام چلا رہا ہے، ہر شخص کی حفاظت کر رہا ہے، تمام خطرات سے بچا رہا ہے، وہ آدمی کو نظر نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو کتنے خطرات سے بچاتا ہے، ہر وقت خطرہ پیش آتا ہے اور اللہ بچا دیتا ہے، اور ایسا بچاتا ہے کہ انسان کو یوں خیال ہوتا ہے کہ ہم بالکل خطرہ ہی میں نہیں ہیں، بلکہ ہم بالکل امن و عافیت کے ساتھ ہیں، ہمیں کوئی خطرہ پیش نہیں آ رہا ہے، حالانکہ یہ حفاظت اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بچا رہا ہے، اسی کے متعلق کہا گیا کہ یہ کیوں ذہن میں نہیں آتا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ بچاتا ہے، جب کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خطرات اتنے زیادہ ہیں، جن سے بچنا مشکل ہے، کبھی کبھی وہ خطرات پیش بھی آ جاتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ یہ دکھا دیتا ہے کہ آدمی خود کتنے پانی میں ہے اور اس کی کیا قدرت ہے، اگر کسی کے سر میں درد شروع ہو جائے تو بعض وقت آدمی ہر طرح کا علاج کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور درد پر قابو نہیں پاتا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حفاظت ہی سے ہوتا ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ہر بات سوچیں گے لیکن یہ

نہیں سوچیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں اور اس کا شکرادا کریں کہ وہ ہماری حفاظت کرتا ہے، وہی نظام چلا رہا ہے، ورنہ یہ نظام خود ہی ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

نظام دو طرح کے ہیں؛ ایک سیاسی نظام ہے اور دوسرا تمدنی نظام ہے، اگر اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت نہ کرے تو یہ سب خود ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائیں گے، ٹرینیں بڑی تیز رفتاری سے پٹری پر چلتی ہیں، اسٹیشنوں سے گذرتی ہیں، اگر ذرا بھی پٹری سے پہیا اٹھ جائے تو پٹری سے ہٹتے ہی پوری گاڑی حادثہ کا شکار ہو جائے گی، لیکن حادثہ کیوں نہیں ہوتا؟ جب کہ لاکھوں گاڑیاں ہر وقت چل رہی ہیں اور ایسے لاکھوں مواقع آرہے ہیں، مگر ایسا نہیں ہو رہا ہے، یہ یوں ہی اتفاقی بات نہیں ہے، انسان خود ڈرائیور کی شکل میں کیا کرسکتا ہے، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتی نظام ہے، لیکن آدمی یہ نہیں سوچتا کہ یہ سارا نظام اللہ تعالیٰ ہی چلا رہا ہے اور ہم کو خطرات سے وہی بچا رہا ہے، بعض مرتبہ ایسے خطرات پیش آتے ہیں کہ ان سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ بال برابر کا فرق ہو گیا ورنہ اس وقت حادثہ ہو جاتا، ہر شخص اپنی زندگی پر غور کرے تو اس کو آٹھ دس ایسے مواقع ضرور نظر آئیں گے کہ بال برابر کا فرق ہو گیا اور وہ بچ گیا، یہ اتفاقاً نہیں ہوتا، کیونکہ معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی چیز بھی اتفاقاً نہیں ہوتی، سب کچھ ایک بندھے ہوئے نظام پر چل رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ خطرات دور کرتا ہے، دن ورات میں جو بھی خطرات انسان کو پیش آتے رہتے ہیں، ان سب سے محفوظ رکھتا ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ مشرک لوگ اپنے رب کی یاد سے اعراض کرتے ہیں، اس سے گریز کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہیں سوچتے، اس کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بچا رہا ہے، اسی نے ان کو حفاظت دی ہے۔

فرضی خداؤں کا حال

﴿أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ تَمْنَعُهُم مِّن دُونِنَا لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنفُسِهِمْ وَلَا هُم مِّنَّا يُصْحَبُونَ﴾ (الأنبياء: ٤٣)

(کیا وہ جو ان کے خدا ہیں ان کو بچا سکتے ہیں ہمارے علاوہ، وہ تو خود اپنی

ہی مدد نہیں کر سکتے اور نہ ہماری طرف سے ان کا ساتھ دیا جاتا ہے)

فرمایا گیا کہ مشرکین نے جن کو خدا بنا رکھا ہے، اور جن کی یہ پوجا کرتے ہیں، کیا وہ ان کو خطرات سے بچا سکتے ہیں، دیکھا تو یہ گیا ہے کہ وہ خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے، دوسروں کی مدد کیا کریں گے، یعنی جن معبودان باطل سے مشرکین مانگتے ہیں اور ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے امیدیں قائم کرتے ہیں، کیا یہ ان کی مصیبت کو ٹال دیں گے؟ ان کی ضروریات کو پورا کر دیں گے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تو خود اپنی ہی مدد نہیں کر سکتے، اگر خود ان پر کچھ مصیبت آجائے تو یہ اس کو بھی نہیں ہٹا سکتے، یا اگر ان پر کوئی پتھر گر جائے تو یہ اس سے اپنے کو نہیں بچا سکتے، معلوم ہوا نہ تو یہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری مدد سے بے نیاز ہو سکتے ہیں، یعنی یہ بھی ہماری مدد پر چل رہے ہیں اور ہمارے تابع ہیں۔

غفلت کا سبب

﴿بَلْ مَتَّعْنَا هَؤُلَاء وَآبَاءهُمْ حَتَّى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا أَفَهُمُ الْغَالِبُون﴾

(الأنبياء: ٤٤)

(بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو لطف کے سامان دیئے ہیں یہاں تک کہ جب ان کی عمر طویل ہوگئی، کیا یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ ہم زمین کو چھوٹا کرتے رہتے ہیں اس کے اطراف سے، کیا یہ ہمیشہ غالب ہی رہیں گے)

اللہ تعالیٰ نہ ماننے والوں کے متعلق نفسیاتی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذکر کرتا ہے کہ یہ لوگ ہم کو کیوں یاد نہیں کرتے اور کیوں جھوٹی چیزوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟ اور یہ لوگ انہیں جھوٹی چیزوں سے امیدیں لگا رہے ہیں جب کہ وہ چیزیں خود اپنی مدد نہیں کر سکتیں اور اس کے علاوہ یہ لوگ کتنے خطرات میں گھرے ہیں،

ان سے بھی ان کو ہم ہی بچاتے ہیں، نہ کہ ان کے یہ معبود۔

فرمایا؛ اس سب کے پیچھے اصل مسئلہ یہ ہے جو کہ انسانی کمزوری بھی ہے کہ ہم نے ان کو جو آرام دیا ہے، جو لطف کے سامان دیئے ہیں، جس سے یہ فائدہ اٹھا رہے ہیں، ان کی زندگی خوشگوار گذر رہی ہے، یہ آرام سے کھا پی رہے ہیں، ہر جگہ آ جا رہے ہیں، امن کے ساتھ رہ رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ لوگ محض اپنی خواہش پوری کر رہے ہیں، اس تعیش پسندی نے ان کو سب کچھ بھلا دیا ہے، ان کی دولت اور عیش نے ان کو غافل کر دیا ہے، یہ صرف اپنی راحت دیکھتے ہیں، راحت کے اسباب پر غور نہیں کرتے اور حالات کو نہیں دیکھتے، یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی دولت کے غرور اور اس کے نشہ میں ہم سے دور ہوتے چلے گئے ہیں، یہاں تک کہ جب ان رنگ بازیوں میں ان کی عمر طویل ہوگئی، یہ لوگ عرصہ تک لطف اٹھاتے رہے، اچھی اور خوشحال زندگی گذارتے رہے، مزے میں عیش کرتے رہے اور لوگوں پر ظلم بھی کرتے رہے، فائدہ اٹھاتے رہے، اس کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں یہ غفلت پیدا ہوگئی، اور حقیقت پر غور کرنا ان سے چھوٹ گیا، بس ان کو جو فائدہ حاصل ہو رہا ہے اسی پر ان کی نظر رہتی ہے، چنانچہ غور کرنے کی دعوت فکر دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ حالات کو دیکھیں، حالات بدلتے رہتے ہیں، اس وقت جو یہ عیش میں ہیں، تو کیا ہمیشہ ان کے باپ دادا عیش ہی میں رہے ہیں؟ ان کو چاہیے کہ یہ دیکھیں کہ حالات میں تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے، کیا یہ نہیں دیکھتے کہ زمین میں ہم کمی پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں، اس کے اطراف کو ہم گھٹاتے چلے جا رہے ہیں، یعنی یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ اسلام بڑھ رہا ہے اور اس کے علاقے پھیلتے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے علاقے تنگ ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس کے علاوہ اس حقیقت پر ہر کوئی نظر ڈال سکتا ہے کہ دنیا میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یکساں حالات نہیں رہتے، کتنے ملک ہیں جو ٹوٹ کر نئے بن گئے، کتنے علاقے پھیل گئے، کتنے کم ہوگئے، جنگیں ہو رہی ہیں، اس میں لوگ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح

کر لیتے ہیں، ایک دوسرے کے علاقے کو چھوٹا کر دیتے ہیں، اسی کے متعلق فرمایا کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے چھوٹا کرتے رہتے ہیں، یعنی ہمارے حکم سے ایسے حالات آتے رہتے ہیں کہ لوگوں کی حکومتیں چلی جاتی ہیں، لوگوں کے علاقے چلے جاتے ہیں، اور دوسروں کے پاس آجاتے ہیں، معلوم ہوا اصل طاقت ہماری ہے، تو ان لوگوں کو غور کرنا چاہیے کہ کیا یہ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یعنی اگر اس وقت ان کو غلبہ حاصل ہے، مثلاً: مکہ والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مکہ کے بادشاہ ہیں، ہم مکہ میں جو چاہیں کریں، مسلمانوں کو جتنا چاہیں پریشان کریں، تو ان کو سوچنا چاہیے کہ کیا یہ ہمیشہ غالب رہیں گے، اور ان کا اقتدار عروج پر رہے گا، کیا ان کو تاریخ کا اندازہ نہیں ہے کہ حکومتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں، بادشاہ ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔

مشرکین کی مثال

﴿قُلۡ إِنَّمَا أُنذِرُكُم بِالۡوَحۡيِ وَلَا يَسۡمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنذَرُونَ﴾ (الأنبياء: ٤٥)

(آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں تم کو ڈرا رہا ہوں (اللہ کی طرف سے) وحی کی بنیاد پر لیکن جو بہرہ ہو وہ آپ کی آواز کو نہیں سنے گا)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں تم سے جو باتیں کہہ رہا ہوں یہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اللہ کی طرف سے یہ وحی کے ذریعہ مجھ کو بتائی گئی ہیں جو سب کا مالک ہے اور ہر چیز دیکھ رہا ہے، اسی کی طرف سے مجھ کو سب کچھ بتایا گیا ہے، ہم تم سے جو باتیں بھی کہہ رہے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں اور تمہارے فائدہ کے لیے کہہ رہے ہیں، لیکن فرمایا کہ جو لوگ بہرے ہو گئے ہوں اور وہ کچھ سنتے ہی نہ ہوں، تو وہ آپ کی بات بھی نہیں سنیں گے، آپ ان کو آواز دیجئے مگر جو بہرہ ہے وہ آپ کی آواز نہیں سنے گا، بہرہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں تو بہرے ہی ہیں، کیونکہ بہرے اور ایسے آدمی میں کوئی فرق

نہیں جو بات کو نہ سمجھتا ہو، کسی انسان کو خطرہ سے ڈرایا جائے، اور وہ اس بات کو نہ سنے اور نہ سمجھے، اس سے کہا جائے کہ دیکھو خطرہ پیش آنے والا ہے، سامنے خندق ہے، رات کا وقت ہے، جہاں تم جا رہے ہو، تمہارے راستے میں خندق ہے، لیکن وہ اس کی کوئی پرواہ نہ کرے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسی میں گرے گا، کیونکہ وہ بہرہ بنا ہوا ہے، حالانکہ جب کہا گیا تھا کہ سامنے خندق ہے تو اس کو ہوشیار ہو جانا چاہیے، خندق سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن ایسا نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہرہ ہے، اسی طرح جب تم (مشرکین) کو بتا دیا گیا کہ تمہاری یہ زندگی تم کو جہنم میں لے جائے گی اور وہاں کی خندق میں گرائے گی، جس راستہ پر تم چل رہے ہو، یہ راستہ منزل مقصود پر نہیں بلکہ کسی گڑھے میں گرائے گا، مگر تم سننے کو تیار نہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ تم بھی خندق میں گرو گے۔

غرض کہ مشرکین سے نبی ﷺ کی زبانی کہلایا گیا کہ ایسا نہیں ہے جو باتیں میں کہہ رہا ہوں، یہ بغیر کسی تجربہ کی روشنی میں ہوں، بلکہ میں وحی کے ذریعہ تم کو ڈرا رہا ہوں، اگر صرف میری بات ہوتی تو تم یہ کہتے کہ تمہیں زیادہ تجربہ نہیں ہے، تمہاری معلومات کم ہیں، لیکن ہم خدا کی طرف سے کہہ رہے ہیں جو ہر چیز سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ تم جو زندگی گذار رہے ہو یہ تباہی کی طرف لے جانے والی ہے جس پر چل کر تم خندق میں گرو گے، اس لیے ہوشیار ہو جاؤ، لیکن مسئلہ وہی ہے کہ جو بہرہ بن گیا ہو یا بہرہ ہو تو وہ کوئی بھی آواز نہیں سنے گا، جب اس کو ڈرایا جائے گا، تب بھی وہ کچھ پرواہ نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی خطرہ محسوس کرے گا۔

خدا کی طاقت

﴿وَلَئِن مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ﴾ (الأنبياء: ٤٦)

(اور اگر تمہارے رب کی طرف سے ان پر مصیبت کا کوئی ایک جھٹکا بھی آجائے تو وہ یہی کہیں گے کہ ہائے ہماری بدقسمتی! ہم واقعی غلط کام کر رہے تھے)

مشرک لوگوں کی کمزور حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ جب ان پر کوئی خطرہ پیش آجائے گا، خواہ وہ خطرہ چھوٹا ہو یا بڑا، اور مصیبت کا ایک جھونکا آجائے گا، تو ان کا حال یہ ہے کہ یوں تو بڑے اکڑ رہے ہیں، غرور دکھا رہے ہیں، لیکن جب مصیبت آئے گی تو پھر روئیں گے، دراصل ہوتا یہی کہ جب مصیبت آتی ہے تو آدمی بد حواس ہوجاتا ہے، اور پھر اس کی سمجھ میں جو بھی تدبیر آتی ہے وہ کرتا ہے، روتا ہے اور پریشان ہوتا ہے، اسی کو فرمایا کہ ایک طرف تو ان کی یہ اکڑ ہے کہ بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں، دوسری طرف یہ حالت ہے کہ اگر تمہارے رب کی طرف سے ان پر مصیبت کا ایک جھونکا آجائے تو اس وقت یہ روئیں گے اور چلائیں گے، اور کہیں گے ہائے ہم قسمت کے بڑے خراب نکلے، واقعی ہم تو بہت غلط راستہ پر پڑے ہوئے تھے، ہم نے بہت ہی غلط کام کیا، آج ہم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں مصیبت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، جس سے یہ واضح ہوگیا کہ کسی چیز کا آنا اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے، جو مصیبت آتی ہے وہ اللہ کے بھیجنے ہی سے آتی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ مصیبت کا آنا بندوں کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

میزان عدل

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئاً وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾ (الأنبياء:٤٧)

(اور قیامت کے روز ہم ان کے اعمال کو منصفانہ طریقہ سے تولیں گے تو کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہیں ہوگی، اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو لے آئیں گے اور ہمارا حساب لگانا بالکل کافی ہوگا)

www.abulhasanalinadw.org

دنیا کا حال ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ آخرت میں ہم باقاعدہ لوگوں کے اعمال تولنے کے لیے ترازو کا استعمال کریں گے، جو بہت ہی منصفانہ طریقہ سے لوگوں کے اعمال تولے گی، کس کا عمل کس درجہ کا ہے، کس کا عمل اچھا ہے، کس کا عمل خراب ہے، یہ سب وہ ترازو بتائے گی، پلہ اٹھ جائے گا تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس شخص کے پاس اعمال حسنہ یعنی اچھے اعمال نہیں ہیں، اور پلہ جھک جائے گا تو اس کا مطلب ہوگا کہ ان کے پاس اچھے اعمال ہیں، اس تولنے کے متعلق یہ بھی واضح کردیا کہ اس دن کسی شخص کے ساتھ ذرا بھی زیادتی نہیں ہوگی، ایسا نہیں ہوگا کہ کسی کو بلاوجہ بغیر کسی جرم کے پکڑلیا جائے اور اس کو سزا دی جائے، بلکہ فرمایا کہ اگر رائی کے برابر بھی کوئی اچھا یا برا عمل ہوگا تو ہم اس کو اس کے سامنے لے آئیں گے، اور اس کو ترازو میں تول لیا جائے گا، اور اس دن ہمارا حساب لگانا بالکل کافی ہوگا، ہم اس دن پورا حساب لگائیں گے کہ کون سا عمل ہے، اس کی کیا جزا وسزا ہے، چنانچہ جو سزا و جزا کی مقدار مقرر ہے اسی کے مطابق بالکل کام ہوگا، ہم ہر ایک کو تول کر دکھا دیں گے کہ دیکھو تمہارے اعمال ایسے ہیں، پھر ہم اس کا صحیح صحیح حساب لگائیں گے اور وہ حساب کافی ہوگا۔

تاریخ کی ایک زندہ مثال

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاء وَذِكْراً لِّلْمُتَّقِينَ☆الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَهُم مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ﴾ (الأنبياء:٤٨-٤٩)

(اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ کی چیز دی تھی اور وہ پرہیز گاروں کے لیے روشنی اور نصیحت تھی، جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے رہتے تھے اور وہ قیامت کا خوف رکھتے تھے)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تاریخ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ تم سے کوئی نئی بات نہیں کہی جارہی ہے، بلکہ یہ ہمیشہ کہی جاتی رہی ہے، تاریخ تمہارے سامنے ہے، اس کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ ہم نے موسیٰ و ہارون کو کتاب دی، جس میں ان لوگوں کے لیے

www.abulhasanalinadw.org

ہدایات اور روشنی تھی جو احتیاط کی زندگی گذارتے ہیں، یہاں پر حضرت موسی و ہارون علیہما السلام کی مثال پیش کی گئی، اس لیے کہ ان دونوں کا زمانہ قریب کا ہے، اور ان لوگوں کو ان کے متعلق بخوبی معلوم ہے کہ حضرت موسی و ہارون کے ساتھ کیا ہوا تھا، اور جب ان کی قوم نے ان کی بات نہیں مانی تو اس کا کیا نتیجہ ہوا تھا۔

اسی لیے فرمایا گیا کہ جو چیزیں ان کو عطا کی گئیں، وہ ان لوگوں کے لیے روشنی کا مینار تھیں جو احتیاط کی زندگی گذار رہے تھے، جو اپنے رب سے بے دیکھے ڈر رہے تھے، اصل چیز ایمان بالغیب ہی ہے، یعنی جو چیز ہم نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی وہ ہم نبی کے کہنے پر مان رہے ہیں، کیونکہ جب ایک سچا آدمی ہم سے کہہ رہا ہے تو ہم یہ کیسے کہہ دیں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، جب کہ وہ آدمی بالکل سچا ہے، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ کر جھوٹے آدمی کی بات بھی مان لیتے ہیں کہ وہ کیوں جھوٹ بولے گا، دنیوی اعتبار سے ہمارا حال یہ ہے کہ اگر ہم کسی خیر خواہ یا تجربہ کار کی بات نہ مانیں تو ہم کو دھوکہ اٹھانا پڑ جاتا ہے، تو آخرت کا معاملہ تو اس سے کہیں زیادہ حساس ہے، جس کے متعلق ایک نبی ہم کو خبر دیتا ہے، اگر دنیا میں ہم سے کوئی شخص کہے کہ تم جس راستہ پر جا رہے ہو، وہاں درخت گر گیا ہے اور راستہ بند ہے، ادھر نہ جاؤ، اگر جاؤ گے تو پریشان ہو گے، لیکن آپ چلے جا رہے ہیں، جب پہنچے تو وہاں دیکھا کہ درخت گرا ہوا ہے اور راستہ بند ہے، چنانچہ اب واپس لوٹ رہے ہیں، اور افسوس کر رہے ہیں کہ واقعی پریشانی ہوگئی، اگر اس کی بات کو مان لیا ہوتا تو اچھا تھا، اب لوٹنا پڑ رہا ہے، اور راستہ بھی لمبا ہو رہا ہے، اگر پہلے ہی چلے جاتے تو اچھا تھا، تو ظاہر ہے کہ یہ تمہاری غلطی تھی، جب تم سے بتا دیا گیا تھا کہ وہاں درخت گرنے سے راستہ بند ہے تو تم نے کیوں پرواہ نہیں کی۔

نبی کی بات کی اہمیت

اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ہم دنیا کے معاملات میں ایسا کرتے ہیں کہ اگر کوئی جھوٹا آدمی بھی کہہ دیتا ہے، تو ہم احتیاط برتتے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہ صحیح کہہ رہا ہو،

www.abulhasanalinadw.org

گرچہ آدمی جھوٹا ہے لیکن ایسی بات کہہ رہا ہے کہ اس کے ہونے میں کوئی بُعد نہیں، لیکن جب نبی ایک بات کہہ رہا ہے جس پر وحی آرہی ہے، جس کو تم نے اچھی طرح جانچ بھی لیا ہے کہ اس شخص نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، اتنی لمبی زندگی میں اس کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا گیا، اس نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا، کبھی غلط بات نہیں کہی، تو اس کی بات ماننے میں کیا تکلف ہو رہا ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ آسمان سے اطلاع آرہی ہے لہٰذا تم غلط راستہ پر نہ چلو، مگر تم پرواہ نہیں کر رہے ہو، بات یہ ہے کہ تم دولت کے نشہ میں اس چیز کو بالکل بھولے ہوئے ہو، تم صرف عیش و آرام میں لگے ہو، جس کو تم چھوڑ نہیں سکتے، یعنی تم اپنے مزے کو نہیں چھوڑ سکتے، یہ جان رہے ہو کہ اس کا نقصان ہے، لیکن یہ کہہ کر ٹال دیتے ہو کہ جب نقصان ہوگا تب دیکھا جائے گا، اسی لیے کہا گیا کہ عیش و دولت کی وجہ سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور پھر اس غفلت میں آدمی بات سنتا ہی نہیں ہے۔

مبارک کلام

﴿وَهَذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ أَفَأَنتُمْ لَهُ مُنكِرُونَ﴾(الأنبياء: ٥٠)

(اور یہ ذکر (قرآن مجید) مبارک کلام ہے تو کیا تم اس کا انکار کروگے)

مشرکین عرب قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت سے مسحور تھے، وہ اندر سے یہ ماننے پر مجبور تھے کہ یہ کلام انسانی صلاحیتوں سے بالاتر ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ کیا تم اس کی تعلیمات کا انکار کروگے، جب کہ تم اس کی بلاغت کو مان رہے ہو، یہ تسلیم کر رہے ہو کہ تمہاری شاعری اس کے سامنے گرد ہے اور اس میں جو باتیں بتائی جا رہی ہیں اس کو بھی تم مان رہے ہو، لیکن عجیب بات ہے کہ پھر بھی تم انکار کرتے ہو۔

ذکر انبیاء

اللہ تعالیٰ نے سورۂ انبیاء میں مختلف انبیاء کا حال بیان کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ ان کو کیا مشکلات پیش آئی ہیں، اس سلسلہ میں پہلی بات یہ جاننے کی ہے کہ نبوت کا سلسلہ جو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے، گویا ایک طریقہ سے حضرت نوح علیہ السلام پہلے بڑے نبی گذرے ہیں، واضح رہے کہ انبیاء میں ایک رسول ہوتے ہیں اور ایک نبی، نبی کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو وحی کے ذریعہ جو غیب کی باتیں بتاتا ہے وہ لوگوں کو بتاتے ہیں، یعنی آخرت ہوگی، مرنے کے بعد جو کچھ ہوگا وہ سب بتاتے ہیں، اور رسول کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغام اور شریعت لاتا ہے، قرآن مجید میں رسولوں کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے، انبیاء تو اس کثرت سے آئے ہیں کہ وہ لاکھ سے زیادہ ہیں، اس لیے ان میں سب کا تذکرہ نہیں ہے، البتہ رسولوں کا تذکرہ بطور خاص موجود ہے۔

انبیاء کی ذمہ داری

انبیاء علیہم السلام نے دعوت کا جو کام کیا، اس کے متعلق قرآن مجید میں کئی جگہ ایسا ذکر آیا ہے کہ نبی کا کام یہ ہے کہ وہ بات کو لوگوں تک پہنچا دے اور ان کو سمجھا دے، اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا ہے، انبیاء علیہم السلام کو دعوت کے کام سے جو مناسبت تھی، اس کے پیچھے بھی خاص اسباب تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو یوں ہی نبی نہیں بناتا ہے، بلکہ

پہلے سے اس کی شخصیت سازی ہوتی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام وسائل و ذرائع سے رکھا ہے، گرچہ یہ بات الگ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بغیر ذریعہ سے بھی کر سکتا ہے، کسی ذریعہ کی اس کو ہرگز کوئی احتیاج نہیں ہے، لیکن چونکہ دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا جائزہ لینے کے لیے بنایا ہے کہ اختیار ملنے پر وہ کیا کرتے ہیں، اختیار نہیں ہے تو جو بھی ہے وہ مجبور ہے، اس کے لیے ایک راستہ متعین ہے، جس کے علاوہ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے، لہٰذا اگر کسی کو منزل تک پہنچنا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ اسی راستہ سے جاؤ، یہاں آدمی کو راستہ بدلنے کا اختیار نہیں ہے، کیونکہ دوسرا راستہ ہی نہیں ہے، اس لیے کسی سے یہ کہنا کہ اسی راستہ سے جاؤ، اس کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ وہاں کئی راستے نہیں ہیں، جن پر اختیار ہو، بلکہ ایک ہی راستہ ہے، ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوقات کا حال ہے، جن کو اختیار حاصل نہیں ہے، ان کو جس کام کے لیے اور جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، وہ اس پر فطری طور پر مجبور ہیں، ان کا وہی مزاج ہے، لیکن یہ انسانوں کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا معاملہ ذرائع کے ساتھ رکھا ہے، یہ دنیا کا ایک نظام ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بنایا ہے، اسی لیے دنیا کے اندر وہ ساری چیزیں اور سارے وسائل رکھ دیئے ہیں جن کی انسان کو ضرورت پڑ سکتی ہے، تاکہ وہ کسی کام کو یہ نہ کہے کہ ہم کیسے کر سکتے ہیں، وہ یہ عذر نہ پیش کر سکے کہ ضرور آپ نے ہم کو اختیار دیا تھا، مگر ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم کو فلاں چیز حاصل نہیں تھی، اس لیے ہم ایسا نہ کر سکے جس کا آپ نے حکم دیا تھا، اسی لیے زندہ رہنے کے لیے اور کام کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے، وہ سارے وسائل اللہ تعالیٰ نے زمین میں رکھ دیئے ہیں، اور کام کرنے کی صلاحیت کے جو پہلو ہیں، وہ سب بھی انسان میں رکھ دیئے ہیں، جس طرح آپ کسی سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس کام سے واقف بھی ہو، مثلاً: اگر آپ لوہار سے بڑھئی کا کام لیں تو وہ نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کو وہ کام جاننا چاہیے، جو آپ اس سے لے رہے ہیں، اسی

طرح اللہ تعالیٰ کو انسان سے جو کام لینا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کام کے کرنے کی اس میں صلاحیت بھی رکھی ہے۔

انسانی صلاحیتوں کا منبع

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو صلاحیت دی ہے، اس کا بڑا ذریعہ عقل اور علم ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ علم و عقل کو نمایاں کیا ہے، علم کہتے ہیں؛ جاننے کو یعنی آدمی کو بات معلوم ہو، جس بات کو اس کو انجام دینا ہے، اس کی معلومات اس کو ہونا چاہیے، جب ہی وہ اس کو انجام دے گا، اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر معلومات کی صلاحیت رکھی ہے، اسی لیے شروع ہی میں فرشتوں کے سامنے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ ہم نے انسان کو علم کے ساتھ بنایا ہے، اس کے علاوہ ایک دوسری چیز اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا فرمائی ہے، جو کام کرنے کی صلاحیت میں معاون ہوتی ہے، یعنی کام کو کیسے کیا جائے، اس میں عقل معاون ہوتی ہے، اور کیا کام کیا جائے، اس میں واقفیت کی ضرورت ہے، غرض کہ علم و عقل دو چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیں اور پھر اس پر ذمہ داری ڈالی، جس کو ان دو چیزوں کی مدد سے انسان کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی ان کا ذمہ خود لیا، اور اس کو زندہ رہنے کے لیے اور اپنی بقا کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کو زمین میں پہلے ہی رکھ دیا، اور کہا کہ اب حسب ضرورت اس کو نکالو اور استعمال کرو، اور وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے زمین میں نہیں رکھیں بلکہ باہر سے دی ہیں، وہ بھی اسی حساب سے مقرر کردی ہیں جس حساب سے انسان کی ضرورت ہے، مثلاً: بارش کا نظام ہے، پانی؛ جس پر ہماری زندگی کا انحصار ہے، یہ سمندر سے ہزاروں میل کے فاصلے سے آتا ہے، یہ بھی پورا ایک نظام ہے، جو اللہ تعالیٰ ہی نے بنایا ہے، سمندر میں گرمی کی وجہ سے بھاپ بنتی ہے، وہ آکر فضا میں ٹھہرتی ہے، اور پھر وہ پھیلتی جاتی ہے، اور پھر زمین کی کشش کے لحاظ سے ایک طرف چلتی ہے اور

ان علاقوں میں پہنچتی ہے جہاں پانی کی ضرورت ہے، پھر اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ وہاں پانی پہنچے، جس کی طرف صاف صاف قرآن مجید میں اشارہ موجود ہے کہ ہم جہاں چاہتے ہیں وہاں کے لیے فرشتوں سے کہتے ہیں کہ بادلوں کو لے جا کر برساؤ۔

دو الٰہی نظام

اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کو دو نظام پر رکھا ہے، ایک نظام ظاہر ہے جو ہمیں نظر آتا ہے، اس سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے، ایک نظام اس کے پیچھے ہے جو ہم نہیں دیکھتے، وہ اللہ کا حکم و فیصلہ ہے، ہر چیز میں اللہ کا فیصلہ اسی کے حکم کے مطابق ہوتا ہے، بیماری اسی کے حکم سے آتی ہے، لیکن ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں وجہ سے یہ بیماری آئی، خوشی کی بات ہوتی ہے، اور انسان کو کوئی راحت ملتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فلاں سبب سے یہ راحت ملی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ ہی کا فیصلہ ہوتا ہے، جس کو ہم نہیں دیکھتے۔

ناشکری کا مفہوم

اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تم جو چیزیں نہیں دیکھتے، وہ چیزیں ہم نے تم کو نبی کے ذریعہ سے بتادی ہیں، لیکن پھر بھی ان پر تم یقین کیوں نہیں کرتے، اس کا مطلب ہے کہ تم ہم کو نہیں مانتے، اگر مانتے ہوتے تو ہماری بات کو بھی مانتے، جب ہم تم کو بتارہے ہیں کہ آخرت میں یہ یہ ہوگا، ہوشیار ہوجاؤ، اس کی تیاری کرلو، مگر پھر بھی تم کیوں انتظام نہیں کرتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہماری بات پر یقین نہیں کرتے، ہم پر تمہارا ایمان مکمل نہیں ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز ہمارے کہنے سے ہوتی ہے، خود بخود نہیں ہوتی، تو تم کو چاہیے کہ اس بات کو سمجھو، جب تمہیں خوشی حاصل ہو، یا کوئی نعمت ملے تو اس کا کیا مطلب ہوا؟ کیا وہ خود بخود تم کو مل گئی؟ نہیں، بلکہ وہ نعمت ہم نے تم کو دی ہے، تو تم کو چاہیے کہ اس کا شکر ادا کرو، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم چھوٹے منھ سے بھی شکر نہیں ادا کرتے، اسی طرح جب تم کو تکلیف پہنچتی ہے وہ بھی ہمارے حکم سے ہوتی

www.abulhasanalinadw.org

ہے،،تو تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے! اللہ ہمیں یہ تکلیف پہنچی ہے اس کو دور فرمادے، ایسی ہٹ دھرمی کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ تم ہم پر یقین نہیں کرتے، تو اس سے بڑھ کر ناشکری کیا ہوسکتی ہے، جب کہ سب کچھ ہم ہی نے تم کو دیا ہے، تمہارے لیے ہر ہر چیز کا تمہارے فائدہ کے لحاظ سے انتظام کیا ہے، تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ساری سہولتیں جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں ان کو ہم واپس بھی لے سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چونکہ آزمائش کے لیے دنیا کا نظام بنایا گیا ہے، اس لیے فرمایا کہ ہم اس دنیا میں سزا نہیں دیں گے، یہاں تو ہم صرف تم کو سمجھائیں گے اور بتائیں گے، اگر تم نہ سمجھو گے تو پھر اس کے لیے آخرت رکھی ہے، جہاں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوگی۔

بعثت انبیاء علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اسی فرق کے سمجھانے اور اللہ تعالیٰ سے انسانوں کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے انبیاء کرام کا پورا نظام بنایا ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کا تسلسل رہا ہے، گاؤں گاؤں، بستی بستی چھوٹے بڑے نبی آئے، اللہ تعالیٰ نے ان میں فرق بھی رکھا ہے، جس علاقہ میں جیسی ضرورت ہوئی، اور جیسی قوم ہوئی اسی حساب سے اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے، ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے کرنے سے ہوتی ہے، چنانچہ جب کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس نبی میں کام کرنے کی صلاحیت پہلے ہی سے رکھتا ہے، پھر باقاعدہ اللہ تعالیٰ اس کی نگرانی اور سرپرستی کرتا ہے، جب یہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے تو پھر نبی کی ہر بات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، البتہ نبوت ملنے سے پہلے اس کی باتیں خود اسی کی ہوتی ہیں، لیکن اس کی طبیعت، اس کا مزاج اور اس کے حالات اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کیا ہوتا ہے کہ انسان جو بہتر سے بہتر بات سوچ سکتا ہے، وہ بحیثیت انسان کے ایک نبی سوچتا ہے، کسی مسئلہ میں بہتر سے بہتر جو رائے قائم کی جاسکتی ہے، وہ رائے نبی قائم کرتا ہے، غرض کہ ایک نبی انسانی صلاحیتوں کے اعتبار سے چوٹی پر ہوتا ہے، یعنی اس کے لیے اللہ

تعالیٰ ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ بہتر سے بہتر انسانی صفات جو کسی انسان میں پیدا ہوسکتی ہیں، وہ اس کے اندر پیدا ہوجاتی ہیں، لیکن اتنا ہے کہ وہ انسانی سطح پر ہی ہوتی ہیں، اور جب اللہ تعالیٰ نبوت دیتا ہے تو اس وقت پھر اس کو انسانی سطح سے اوپر کی چیز مل جاتی ہے، انسانی سطح کی چیز تو اس میں بہتر سے بہتر ہے ہی، لیکن نبوت ملنے کے بعد مزید اس میں اللہ کی طرف سے سرپرستی ہوتی ہے کہ تم یہ کرو اور یہ نہ کرو، چنانچہ اس کا درجہ بہت اونچا ہوجاتا ہے، وہ انسان ہوتے ہوئے بہت بلندترین جگہ پر ہوتا ہے۔

انبیاء کے واقعات کا مقصد

سورۂ انبیاء کی جن آیات میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، یہ بہت ہی دوررس اشارے دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے اور بندوں کے درمیان کے تعلق کو ظاہر فرماتا ہے، اور بار بار یہ بتاتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، وہی سب کچھ کرتا ہے، لیکن بسا اوقات انسان دھوکہ میں آجاتا ہے، اور وسائل وذرائع کو اصل سمجھ لیتا ہے، جب کہ وسائل وذرائع بھی اللہ تعالیٰ ہی نے رکھے ہیں، اس نے یہ نظام بنایا ہے کہ وہ انہیں سے کام کرتا ہے، لیکن اتنا طے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، جیسے ہم انسانوں میں اس کی مثالیں اللہ نے رکھی ہیں کہ ہم تلوار استعمال کرتے ہیں، ہم اوزار استعمال کرتے ہیں، تو جو کچھ بھی ہم استعمال کرتے ہیں وہ سب اوزار کررہے ہیں، اسی طرح ہم سواری استعمال کرتے ہیں تو وہ ہم کو پہنچادیتی ہے، گویا وہ سواری ہمارے پہنچنے کا ایک ذریعہ بنتی ہے، لیکن چونکہ ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ سواری ہمارے اختیار میں ہے، وہ خود سے نہیں پہنچاسکتی، ہم کتنی ہی خواہش کریں، کتنی ہی طلب ہو، لیکن وہ خود نہیں پہنچائے گی، جب تک آپ اس کو استعمال نہ کریں، تو خواہ کتنی ہی خواہش ہو، کتنا ہی گاڑی کے سامنے کھڑے ہوکر روئیں اور لجاجت کریں، مگر وہ نہیں پہنچاسکتی، اس لیے کہ بغیر کسی کے ہاتھ لگے یہ چیز اس کے اختیار میں نہیں، بلکہ وہ گاڑی بنانے والے کے تابع ہے، جس نے بنانے میں جس

حساب سے اس کے پرزے رکھے ہیں، وہ اسی حساب سے کام کریں گے، وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کریں گے، اسی طرح آپ نے پنکھا چلا دیا تو وہ چلتا رہے گا، جب تک کہ آپ اس کو بند نہ کریں وہ ہوا دیتا رہے گا، اور آپ کو فائدہ پہنچاتا رہے گا، مگر وہ خود کچھ نہیں کرے گا، کیونکہ وہ ایک ذریعہ ہے، غرض کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا ہے یہ سب ذرائع سے ہوتا ہے، لیکن ذرائع خود اختیار نہیں رکھتے، بلکہ اللہ تعالیٰ آزمائش کے لیے ایک حد تک انسان کو ان ذرائع کے استعمال کرنے کا اختیار دیا ہے، جیسے کسی کو ایک وسیع مکان میں بند کر دیا جائے اور کہا جائے کہ تم اس کے اندر ہر جگہ جا سکتے ہو، مگر اس کے باہر نہیں جا سکتے، وہاں جانے کا اختیار نہیں ہے، البتہ یہاں کہیں بھی جائیے، کہیں بھی لیٹئے، آپ کو سب اختیار ہے، لیکن باہر کا اختیار نہیں ہے، اسی طرح ایک چھوٹے سے دائرہ میں انسانوں کو اللہ نے اختیار دیا ہے، تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ انسان اختیار سے کتنا کرتا ہے اور کتنا نہیں، اختیار کی بنیاد پر وہ اپنی خواہش پر چلتا ہے یا اپنے رب کی پسند پر چلتا ہے، اب کیا چیزیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں، ان کو بتا دیا گیا ہے کہ خالق و مالک کو کیا چیزیں پسند ہیں اور کیا چیزیں ناپسند ہیں، بس اب یہ دیکھنا ہے کہ آپ کی پسند اللہ کی پسند کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے، چنانچہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ترازو مقرر کر رکھی ہے، لہٰذا تم جو بھی عمل کرو گے وہ اس میں تلتا ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ آپ نے اللہ کی پسند کو اپنی پسند پر کتنی ترجیح دی، ترجیح نظر آنے والی چیز نہیں ہے، لیکن حقیقت میں وہ وزن رکھتی ہے، چنانچہ آپ نے اپنی پسند کے مقابل اللہ تعالیٰ کی پسند کو جتنی ترجیح دی ہوگی، اس کا اتنا ہی وزن ہوگا، گویا اس کا وزن وہاں بنتا چلا جا رہا ہے، اسی وزن کے مطابق اللہ تعالیٰ حساب لے گا، حساب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کا کتنا وزن ہے اس کو تولا جائے گا، پھر اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو جزا دے گا۔

اس سورہ میں انبیائے کرام علیہم السلام کے جو واقعات بتائے گئے ہیں، ان کا یہی مقصد ہے کہ لوگوں کو ان کا اختیار اور ان کی حیثیت سے متعارف کرایا جائے، لوگ

www.abulhasanalinadw.org

یہ دیکھ سکیں کہ نبی کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ انسانوں جیسا ہے، ان کے ساتھ فرشتوں والا کوئی معاملہ نہیں ہے کہ فرشتوں کو خود اختیار بھی نہیں ہے، بلکہ وہ محض اللہ تعالیٰ ہی کی پسند پر چلتے ہیں، جیسے پنکھا آپ کے چلانے پر چلتا ہے، اسی طرح فرشتے بھی اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتے ہیں، بس اللہ تعالیٰ کا چاہنا کافی ہوتا ہے، یہاں تو ہم کو پھر بھی بٹن دبانا پڑتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو بٹن دبانے کی بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا چاہنا ہی کافی ہے، جو وہ چاہے کہ ہو جائے وہ ہو جائے گا، جس کا وہ حکم دے گا، فرشتے فوراً وہ کام کریں گے۔

ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے جو خصوصیات رکھ دی ہیں وہ اس میں پائی جاتی ہیں، جیسے پنکھے کا کام ہوا دینا ہے، تو وہ ہوا دے رہا ہے، اسی طرح آپ نے کوئی پودا لگایا، اب اس کا پروسیجر (Procedure) چلے گا، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بنایا نظام ہے، درخت کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہے، کیونکہ وہ تابع ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جو نظام مقرر کیا ہے وہی نظام چلے گا، اس کے علاوہ اگر آپ کچھ چاہیں تو نہیں ہوگا، لیکن اس سے ہٹ کر ایک دائرہ میں انسان کے چاہنے کا اللہ تعالیٰ نے اختیار رکھا ہے، اسی اختیار کے استعمال کرنے کو ''اعمال'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، انہیں کے وزن سے آدمی کے آخرت کے حالات متعین ہوں گے، اور وہاں کی زندگی متعین ہوگی۔

واقعات کے دو رخ

آئندہ صفحات میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کے لیے چاہا، ان کو انسانی طاقت سے زیادہ طاقت بھی دے دی، جیسا کہ حضرت سلیمان وداؤد علیہما السلام کا واقعہ میں آئے گا، اس میں بتایا گیا ہیکہ وہ لوہے کو موڑ دیتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قدرت دی تھی کہ وہ ہوائی جہاز کی طرح چلے جاتے تھے، جب جہاز ایجاد نہیں ہوا تھا تو لوگوں کو اس

بات پر تعجب ہوتا تھا کہ وہ کیسے ہوا کے دوش پر اڑتے ہوں گے، لیکن اب یہ بات ہر ایک کو بخوبی سمجھ آتی ہے، گویا نئی ایجادات ان چیزوں کی تصدیق کرتی ہیں جو قرآن مجید میں بتائی گئی ہیں، آج ایک معمولی سی ڈی کے اندر پورے پورے کتب خانے آگئے ہیں، جس کے بعد کراماً کاتبین کو سمجھنا کیا مشکل ہے، پہلے لوگ سوچتے تھے کہ فرشتے کاندھے پر کیسے بیٹھے ہیں، کہاں لکھ رہے ہیں، کیسے کاتب ہیں، کیا ان کے پاس کاغذ ہے، وہ کیسے سارے اعمال لکھتے ہیں، اور انسان کا جو حال وقال ہے وہ سب کیسے لکھ رہے ہیں، معلوم ہوا اس سب کا مطلب ہے کہ وہ ہماری ایک ایک چیز ریکارڈ کررہے ہیں، اب آپ دیکھیں کہ ذراسی سی ڈی میں ساری تصویریں اور سب چیزیں آجاتی ہیں، جس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ کتنا اختیار اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے، غرض کہ سب کے اعمال واحوال کراماً کاتبین ریکارڈ کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی ریکارڈ کی ہوئی یہی سی ڈی قیامت میں لوگوں کو دکھائے گا۔

قرآن مجید میں آتا ہے کہ اعمال نامہ ایک سی ڈی ہے جب یہ وہاں کھلے گی تو انسان دیکھے گا کہ ہم نے دنیا میں کیا کیا، تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اب تم بولو تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے، ظاہر ہے کہ مجرم اپنا جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا، اب مجرم کیا کہہ سکتا ہے، اگر کسی مجرم کو آپ جرم کی حالت میں پکڑ لیں تو وہ کیا کہے گا، صرف معافی کی خوشامد ہی کرے گا، یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے جرم نہیں کیا، بلکہ جرم کے اقرار کے ساتھ معافی کی درخواست کرے گا، اور آخرت کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں معافی کا کوئی راستہ نہیں، بلکہ وہاں تو یہ ہے کہ جو یہاں کیا ہے وہ وہاں ملے گا، قرآن مجید میں صاف صاف آتا ہے کہ جب وہ لوگ یہ کہیں گے کہ ہمیں دنیا میں دوبارہ بھیج دیجئے ہم اچھے عمل کرکے آئیں گے، تو کہا جائے گا کہ نہیں، ہم نے نبیوں اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے تم کو خوب سمجھایا تھا، سب کچھ تم کو بتادیا گیا تھا، لیکن تم نے نہیں مانا تو اب تو سزا بھگتنا ہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَى عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُم مِّنْ عَذَابِهَا كَذَلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُورٍ☆وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيْهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحاً غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِن نَّصِيْرٍ﴾ (الفاطر: ٣٦-٣٧)

(اور جنھوں نے انکار کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ہی ان کا کام تمام کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی، اسی طرح ہم ہر انکار کرنے والے کو سزا دیں گے، اور وہ اس میں چلا چلا کر کہیں گے کہ ہمارے رب ہمیں نکال دے جو کام ہم کیا کرتے تھے ان کو چھوڑ کر ہم اچھے کام کریں گے (ارشاد ہوگا کہ) کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرلے اور ڈرانے والا بھی تمہارے پاس آیا تو اب مزہ چکھو، بس ظالموں کا کوئی مددگار نہیں)

انسانی زندگی کی اصلاح کا انحصار

اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھنا اور کراماً کاتبین کا تصور رکھنا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اس پر انسان کی زندگی کی اصلاح کا بڑا انحصار ہے، اللہ تعالیٰ جس کی یہ قوت ہے کہ اس نے یہ ساری کائنات بنائی، آسمان و زمین بنائے، اس کو دیکھنے سے نظر عاجز آجاتی ہے کہ اس نے اتنا بڑا اور وسیع عالم بنایا ہے، لیکن اس سے ہم نہیں ڈر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ ایک معمولی افسر سے ڈرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی اس بات پر یقین نہیں ہے، جو اس نے ہمیں اپنے خاص بندوں کے ذریعہ سے بتائی، اور جب یقین نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ سامنے آئے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ اس سورت میں بطور خاص انبیاء کا ذکر کر کے یہ دکھا رہا ہے کہ سب اس کے سامنے چھوٹے ہیں،

معلوم نہیں تم دنیا میں کس کو بڑا سمجھ لیتے ہو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں میں سب سے افضل انبیاء ہیں، اوران کے ساتھ اللہ کا معاملہ حاکمیت والا ہے۔

اس سورت میں انبیاء کا حال ذکر کرتے ہوئے ایک طرف اللہ تعالیٰ نے یہ دکھایا کہ کچھ لوگوں کو اللہ نے اس مقام پر پہنچادیا کہ وہ ہوا کے دوش پر اڑے چلے جارہے ہیں، وہ شیاطین و جنات کو مجبور کررہے ہیں کہ سمندر میں گھسو، محل بناؤ اور یہ کرو وہ کرو، اوران سب کا حال یہ ہے کہ وہ سب مجبوراً بنارہے ہیں، ایسے مجبور ہوکر بنارہے تھے کہ قرآن مجید میں آتا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہوا تو کسی کو پتہ نہیں چلا، وہ ڈنڈے پر ٹیک لگائے کھڑے تھے اور سب یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ زندہ ہیں، جب ان کو معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہوگیا تو وہ افسوس کرنے لگے کہ اگر ہم کو پہلے معلوم ہوتا تو ہم کیوں اتنی مصیبت میں پڑے رہتے، ہم تو ڈر کے مارے کام کررہے تھے، جب وہی نہیں رہے تو ہم آزاد ہوجاتے، معلوم ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کو اتنا اختیار دیا گیا تھا۔

اسی طرح یہ بھی دکھایا کہ ہم نے اپنے بعض انبیاء کو شدید حالات سے بھی گذارا، حضرت ایوبؑ کی اس کی مثال ہیں، گویا اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ صاف کردیا ہے کہ ہم جس کو چاہیں اتنا اختیار و مقام دیں، یہ سب ہمارے سامنے تابع ہیں۔

مقصد حیات کی اعلیٰ مثال

انسانوں کی زندگی کا جو مقصد ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہترین مثال دی ہے، وہ ہر ایک کے لیے اعلیٰ معیار ہیں، گویا کہ وہ ان ساری کیفیات کے جامع ہیں، جن کی کسی اسوہ کو ضرورت ہوتی ہے، اسی لیے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے بیان کرکے اللہ تعالیٰ نے نبوت کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ بتائی کہ نبوت کوئی انعام نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو نبی بنادیا، اور پھر اس کو ساری راحتیں حاصل ہوجائیں، ساری نعمتیں حاصل

www.abulhasanalinadw.org

ہوجائیں، کیونکہ وہ بہت اونچا درجہ ہے، جیسے کسی بڑے افسر کا معاملہ ہوتا ہے، ایسا کچھ نہیں ہے، بلکہ نبی کو انسان رہتے ہوئے نبوت کا کام کرنا ہوتا ہے، وہ انسان کے دائرہ سے نہیں نکلتا ہے، فرشتہ نہیں ہوجاتا، اسی لیے اس کو تمام انسانی مشکلات پیش آتی ہیں، یعنی جب وہ لوگوں کو دعوت دے گا تو مختلف لوگوں سے اس کو سابقہ پڑے گا، کوئی غصہ کرنے والا ملے گا، تو کوئی نرم مزاج ہوگا، کوئی سمجھ دار ہوگا تو کوئی بے وقوف ملے گا، کوئی نفس پرست ملے گا تو کوئی مخلص بھی ملے گا، غرض کہ اس کو متعدد لوگوں سے انسانوں میں سے سابقہ پڑے گا، اور انسان کے اندر جو مختلف جذبات واحساسات ہیں، ان سب کو نبی کو جھیلنا پڑے گا۔

نبی کے پاس جو دنیوی وسائل ہوتے ہیں، وہ بھی معمولی ہوتے ہیں، ویسے تو انسانوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ آپ جیسا کام کریں گے ویسی ہی آپ کی آمدنی ہوگی، آپ کاروبار کررہے ہیں تو آپ کی آمدنی بہت ہورہی ہے، لیکن نبی کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ دعوت کا کام کرے گا تو اس کو کمانے اور محنت کرنے کا موقع کہاں ہے؟ لیکن پھر بھی اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا کہ اس کے لیے آسمان سے رزق اترنا شروع ہوجائے، بلکہ اس کے لیے وہی نظام مقرر کیا کہ تم کو دنیوی زندگی میں جو بھی پیش آئے اس کو برداشت کرو، چنانچہ نبیوں کو فاقے بھی کرنے پڑے، ان کو طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آئیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

قرآن مجید کی بلاغت

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ انبیاء کے واقعات میں پہلے بیان کیا، کیونکہ آپ ایک مثال ونمونہ ہیں، اس نمونہ کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، آپ دیکھیں گے قرآن مجید میں کہیں واقعہ تفصیل سے کہیں اختصار سے بیان کیا گیا ہے، یہ بلاغت کی بات ہے، موقع محل کی بات ہے، کون مخاطب ہے اور کیا موقع ہے، اس کے لحاظ سے بات کو پھیلایا جاتا ہے اور مختصر کیا جاتا ہے، بعض دفعہ ایسا موقع ہوتا ہے کہ بات مختصر کہی جاتی ہے، اگر پھیلا کر کہی جائے تو وہ مضر ہو جاتی ہے، اور اس سے مقصد کو نقصان پہنچتا ہے، اور بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ اسے پھیلا کر کہنا ہوتا ہے، اگر اس کو مختصر کر کے کہیں تو بات کارآمد نہیں ہوتی اور سمجھ نہیں آتی، یہ بھی بلاغت کی بات ہے، اور چونکہ قرآن مجید میں آخری درجہ کی بلاغت پائی جاتی ہے، اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ بعض واقعات کو بار بار ذکر کیا گیا ہے، اور بعض کو بس ایک دو جگہ پر ذکر کیا گیا ہے، بعض جگہ وہی واقعہ ایک جگہ پھیلا کر بیان کیا گیا ہے، اور ایک جگہ مختصر بیان کیا گیا ہے، یہ سب کیوں کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو سننے والوں کی نفسیات اور ان کے سمجھنے کی خصوصیات اور ان کے دل اور دماغ کی کیفیات بھی معلوم ہیں، اسی لیے

قرآن مجید نے لوگوں کے دلوں پر جو غیر معمولی اثر ڈالا، اس کی کہیں بھی مثال نہیں ملتی، ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ صحابہ کرام میں نصف تعداد وہ ہے جو صرف قرآن مجید سن کر مسلمان ہوئی، کیونکہ اس نے ایک دم دل پر جا کر چوٹ ماری۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کو قرآن مجید میں کئی جگہ بیان کیا ہے، صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نہیں بلکہ دوسرے انبیاء میں سے کئی کے واقعہ کو بار بار بیان کیا گیا ہے، لیکن بعض وہ انبیاء بھی ہیں جن کا صرف ایک ہی مرتبہ بیان کیا گیا ہے، دراصل قرآن مجید بلاغت کے انتہائی معیار کی کتاب ہے، بلاغت کو ادب کے لفظ سے بھی تعبیر کرتے ہیں کہ بات کو اس انداز سے کہا جائے کہ وہ مخاطب کے ذہن اور اس کے دل میں اتر جائے، یوں تو الفاظ سب کو معلوم ہیں اور سب استعمال کرتے ہیں، لیکن الفاظ کی ترتیب اور مترادف الفاظ جو ہوتے ہیں، یعنی ایک ہی معنی کے کئی لفظ ہوتے ہیں، وہ بظاہر تو مترادف ہوتے ہیں، اور کئی لفظ ہوتے ہیں، جو ایک ہی معنی کے ہوتے ہیں، البتہ معنی کی کیفیات میں فرق ہوتا ہے، تو بات کرنے والے کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ بات کو اس انداز سے کہے کہ دل ودماغ میں اتر جائے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بالکل طبعی وفطری انداز میں بیان کیا گیا ہے، جیسے کوئی کسی واقعہ کو اس طرح بیان کرے جیسے اس کو دیکھ رہا ہے اور اس کا ایک ایک جز بیان کر رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق میں تھے، جنوب عراق میں ایک جگہ ہے جو کہ ختم ہوگئی تھی، لیکن نئی کھدائی اور نئی تحقیقات میں وہ پورا شہر نکل آیا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پورا شہر زمین کے اندر کھدائی سے مل گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام تقریباً آج سے سات ہزار سال پہلے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو قوم تھی، وہ بابل کی رہنی والی تھی، بابل عراق کا ایک مشہور ومتمدن شہر تھا، چونکہ اس زمانہ میں عراق میں تہذیب بہت ترقی کرگئی تھی، اس لیے وہ بڑا متمدن ملک تھا، جیسے آج

www.abulhasanalinadw.org

امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک ہیں، اسی طرح عراق بھی تہذیب کا مرکز تھا اور بابل وہاں کا مشہور شہر تھا، یہاں آبادی بھی تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ علم بھی تھا اور تمدن کی جو چیزیں ہوتی ہیں وہ سب بھی تھیں، لیکن ان کا مذہب ستارہ پرستی تھا، یہاں کے باشندے ستاروں کی پوجا کرتے تھے، جیسا کہ مشرکین کے یہاں بت علامت ہوتے ہیں جن کی وہ پوجا کرتے ہیں۔

درحقیقت اللہ کو چھوڑ کر ان سب چیزوں کی عبادت صرف انسانی کمزوری ہے اور بے خیالی ہے کہ انسان ظاہر کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتا ہے اور اسی پر اپنی پوری عمارت قائم کر دیتا ہے، اس کے اندر حقیقت میں جانے کی کوشش نہیں کرتا، صرف سامنے کی چیز کو دیکھ کر فیصلہ کر دیتا ہے، مثلاً: آپ چمچے سے کھا رہے ہیں تو اگر کسی وجہ سے آپ کا ہاتھ نہ دکھائی دے اور صرف چمچہ دکھے، تو ظاہر میں آدمی یہ سمجھے گا کہ چمچہ ان کو کھلا رہا ہے، حالانکہ چمچہ بے چارہ بالکل بے بس ہے، اسی طرح کچھ لوگ محض سورج و چاند اور ستاروں کی چمک دمک کو دیکھ کر انہیں کو اپنا معبود حقیقی سمجھنے لگے، اور انہیں کی عبادت کرنے لگے، جب کہ ان کو چمکانے والی ذات کوئی اور ہے۔

نجومی تحقیقات

اس زمانہ میں نجومی تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے علمی تحقیقات کی تھیں، گویا علم نجوم اور آسمان کی چیزوں کی تحقیقات بہت پہلے سے شروع ہیں، ہزاروں سال پہلے سے اس میں انسان نے ترقی کی ہے، اور معلومات حاصل کی ہیں، اور جو معلومات حاصل کی ہیں وہ غیر معمولی ہیں، ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، انہوں نے دریافت کیا کہ ستاروں کے اتنے فاصلے ہیں کہ روشنی کی رفتار سے بھی اس چیز کے وہاں پہنچنے میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں، اسی سے یہ بات بھی سوچنا چاہیے کہ کل کائنات کتنی بڑی ہے، جو نئے علم والے ہیں جہاں تک یہ پہنچے ہیں، ان کی تحقیق کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ کھربوں کہکشائیں ہیں، کھربوں سورج ہیں اور ہر سورج اپنے اندر پورا ایک

www.abulhasanalinadw.org

عالم رکھتا ہے، ہمارا جو عالم ہے یہ سورج کا عالم کہلاتا ہے، جس کے ارد گرد نو سیارے چکر لگا رہے ہیں، اب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سورج کروروں ہیں اور پھر کہکشائیں کروروں ہیں تو کتنی بڑی کائنات ہوگی، ایک اندازہ کے مطابق تو ہم کو معلوم ہوگئی ہے، اور اس کے آگے کی معلوم نہیں ہے۔

غرض کہ اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بہت ہی وسیع بنائی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی نظر میں چھوٹی ہے، چنانچہ جو لوگ ظاہر پر فیصلہ کرتے ہیں، وہ اس کائنات کے ظاہر کو دیکھ کر اسی پر فیصلہ کر لیتے ہیں، اور ان میں سے کسی چیز کو اپنا آقا تصور کر بیٹھتے ہیں، کیونکہ یہ بھی ایک ضرورت کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر طبعی طور پر یہ احساس رکھا ہے کہ مذہبی طور پر اس کو کسی سے عقیدت ہو جاتی ہے، اس نیت سے جس کو وہ ناقص سمجھتا ہے، انسان کو بعض وقت کچھ ایسے حالات پیش آتے ہیں جن سے وہ سمجھتا ہے کہ کوئی انسان ہماری مدد نہیں کر سکتا، بلکہ کوئی ایسا ہی مدد کر سکتا ہے جس کی طاقت انسانوں سے زیادہ ہو، اب انسانوں سے زیادہ طاقت کس میں ہے؟ تو نظر ڈالتے ہیں تو کسی نے کہا کہ ستارے میں ہے، کسی نے کہا کہ چاند میں ہے، کسی نے کہا سورج میں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ جس نے جس کو جتنا سمجھا وہ اپنی اسی عقیدت کے مطابق اپنا معبود بناتا گیا۔

بت پرستی کی شکلیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے چاند وسورج کو دیکھ کر بڑے بڑے مندر بنا رکھے تھے، کوئی کسی ستارہ کا مندر تھا، کوئی کسی ستارہ کا، اور ان میں مختلف بت رکھ لیے تھے جو ان ستاروں کی علامت تھے، انہیں کی وہ پوجا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ان کی پوجا کرنے سے فلاں ستارے راضی ہو جائیں گے، اور وہ راضی ہو جائیں گے تو ہمارا کام بن جائے گا، انہیں کے اختیار میں سب کچھ ہے، البتہ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی مانتے تھے، گویا ان ستاروں کو اللہ تعالیٰ کی ذات تسلیم کرنے کے بعد

یہ درجہ دیتے تھے، اسی لیے اس عمل کو شرک کہتے ہیں، شرک کہتے ہی شریک کرنے کو ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت وعظمت میں کسی کو شریک کرنا یہی شرک ہے، شرک چھوٹی چیزوں کا بھی ہوتا ہے اور بڑی چیزوں کا بھی ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ عام طور پر ستارہ پرست تھے، جیسے مصر میں فراعنہ کی جو تہذیب وتمدن تھا وہ سورج پرست تھے اور سورج کو اپنا خدا سمجھتے تھے، اور جو بادشاہ یعنی فرعون ہوتا تھا وہ اس خدا کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا، اس کو وہ سارے اختیارات ہوتے تھے جو خدا کے ہوتے ہیں، اسی لیے وہ اپنی خدائی چلاتا تھا، مگر اصلاً وہ خود سورج کی پرستش کرتا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ ستاروں اور چاند وسورج کی پرستش کرتے تھے۔

صاحب فہم وفراست

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِه عَالِمِينَ﴾

(الأنبياء: ٥١)

(اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے سمجھ عطا کردی تھی اور ہم ان کو خوب جانتے تھے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بڑی سمجھ عطا فرمائی تھی، بچپن ہی سے ان کو سمجھ حاصل ہوگئی تھی، اپنی کم عمری ہی میں انہوں نے یہ غور کیا کہ ہماری قوم ستارہ پرست ہے، اس لیے کہ وہ انہیں ستاروں کو سب سے زیادہ معتبر وطاقتور سمجھتی ہے، تو کون سی وہ طاقت ہے جو انسان کے اس مسئلہ کو حل کرسکتی ہے جس کو انسان خود نہیں کرسکتا، نہ علاج سے حل کرسکتا ہے، نہ کسی اور ذریعہ سے کرسکتا ہے، تو انہوں نے دیکھا آسمان پر کہ چمکتے ہوئے ستارے ہیں تو سوچا کہ ہماری قوم تو اس کو معبود سمجھتی ہے کہ یہ ہماری قسمت بگاڑنے و بنانے والے ہیں، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو چکر لگا کر نکل گئے اور صرف چکر ہی لگا رہے ہیں، خود ان کی طرف سے کوئی نئی چیز سامنے نہیں آرہی، جیسے کسی کو اختیار ہوتا ہے تو وہ اپنے طریقہ سے چلتا ہے، وہ کسی دوسرے

www.abulhasanalinadw.org

کے نظام کا پابند نہیں ہوتا، لیکن ایک چیز وہ ہے جو بالکل ایک نظام کی پابند ہے، ایک ہی ڈھرے پر چل رہی ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس ڈھرے پر اس کو کون سی چیز چلا رہی ہے، اگر خود اس کو کچھ اختیار حاصل ہوتا تو وہ اپنا راستہ بدل لیتا، اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ تو آتے ہیں، نکلتے ہیں، ڈوبتے ہیں تو یہ کیسے خدا ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ پھر انہوں نے چاند کے متعلق سوچا، لیکن اس کو دیکھا کہ وہ بھی بالکل پابند ہے اور ذرا بھی اپنے راستہ سے نہیں ہٹتا، پھر سورج کو سوچا تو بھی یہی معاملہ ہوا، غرض کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انہوں نے کہا: یہ سب خدا نہیں ہو سکتے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے گذارش کی کہ اے پرروردگار! اے خدا! جو سب کا مالک ہے، ہم کو ہدایت دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہدایت ملی اور انہوں نے کہا کہ ہمارا رب وہی ہوسکتا ہے جو ان سب سے بڑا ہے، ان سب سے اونچا ہے، جو کسی کو اپنی بڑائی کی وجہ سے نظر نہیں آسکتا، وہی ہمارا رب ہوسکتا ہے، ورنہ یہ جو اتنی بلندی پر گردش کر رہے ہیں یہ بھی مجبور ہیں اور کسی کے ماتحت ہیں، تو جو ان سے بڑا ہے وہ بہت بڑا ہوگا، گویا اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کو خود اپنی غور و فکر سے حاصل کر لیا، اور توحید ہے بھی ایسی چیز کہ اگر آدمی دوسری چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر، غیر جانب دار ہو کر سوچے تو آخر میں توحید ہی تک پہنچتا ہے، اس لیے کہ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے کہ سارا عالم جو بالکل ایک منظّم طریقہ سے چل رہا ہے، یہ خود بخود کیسے چل سکتا ہے، لہٰذا ظاہر بات ہے کہ ان کا چلانے والا ان سے بڑا ہوگا، جب ہی وہ ان کو چلائے گا، اور جب ان سے بڑا ہوگا تو ہم کو نظر کیسے آئے گا، وہ اس سب سے بلند و بالا ہے، تو اس طرح خود آدمی کا ذہن اس کو توحید تک پہنچا دیتا ہے، بشرطیکہ اس کے ذہن کو خراب کرنے والی چیزیں نہ ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَـٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ☆ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ☆ قَالَ لَقَدْ كُنتُمْ

www.abulhasanalinadw.org

أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ☆قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ☆قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَى ذَلِكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ﴾(الأنبياء: ٥٢-٥٦)

(جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ تم نے کیا مجسمے بنا رکھے ہیں جن کے سامنے تم جھکتے ہو، انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی عبادت کرتے دیکھا ہے، انہوں نے کہا؛ بے شک تم اور تمہارے باپ دادا کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا رہے، انہوں نے (قوم کے لوگوں نے) کہا کیا تم کوئی سچی و پکی بات لے کر آئے ہو یا تم تفریحا اور لطف کے لیے ایسا کہہ رہے ہو، انہوں نے فرمایا؛نہیں، بلکہ تمہارا رب اور سارے آسمان و زمین کا رب وہ ذات ہے جس نے ان سب کو بنایا اور میں اس (حقیقت) پر پورا یقین رکھتا ہوں)

توحید سراپا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے بذات خود اللہ کی دی ہوئی سمجھ سے بالکل غیر جانب دار ہو کر توحید کی حقیقت کو سمجھا، پھر اس کے بعد اپنی قوم کو بھی اس کی طرف دعوت دی، ان کے والد بھی ایک بڑے مندر کے پجاری اور اس کے ذمہ دار تھے، تو انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ تم نے کیا مجسمے بنا رکھے ہیں، جن کے سامنے تم جھکے رہتے ہو، رکوع کرتے ہو، سجدہ کرتے ہو اور ان سے متعلق ہو، تو ان کی قوم نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے، لہٰذا ہم انہیں کی نقل کرتے ہیں، یعنی ہم اس پر غور نہیں کرتے کہ یہ خدا ہو سکتے ہیں یا نہیں، بس ایک ڈھرا چلا آرہا ہے، اسی پر ہم چل رہے ہیں، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام یوں گویا ہوئے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم خود اور تمہارے باپ دادا دونوں غلط

کام اور گمراہی میں مبتلا رہے ہیں، یعنی ایک کام کرتے چلے جارہے ہیں، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہ حق ہے یا باطل ہے، تو یہ تو بے وقوفی کی بات ہے، اس لیے سن لو! تم بھی اور تمہارے باپ دادا سب کھلی گمراہی میں تھے، تم لوگ ایسی چیزوں کو بڑا سمجھ رہے ہو جو خود بھی کچھ حرکت نہیں کرسکتیں، چنانچہ ان کی قوم کے لوگوں نے کہا کہ ابراہیم! تم کیسی بات کررہے ہو، کیا تم کوئی سچی اور پکی بات لے کر آئے ہو یا محض تفریحاً اور ایک لطف کے لیے ایسا کہہ رہے ہو، یعنی یہ جو تم ہم پر اعتراض کررہے ہو، کیا اس کی کوئی بنیاد ہے، یا یہ کہ تم نے تفریح کے طور پر یہ بات کی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا؛ نہیں، بلکہ ہمارے سامنے یہ حقیقت ہے کہ تمہارا رب، سارے آسمانوں اور زمینوں کا مالک وہ رب العالمین ہے، جس نے ان سب کو بنایا ہے، ان سب کو پیدا کیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ جو آسمان وزمین جس کی چیزوں کی تم پوجا کررہے ہو ان کا جو پیدا کرنے والا ہے، اصلاً وہی رب ہوگا، یہ رب کیسے ہوجائیں گے، یہ تو خود بنے ہوئے ہیں اور ایک ذات کے پابند ہیں، اس سے یہ بات خود سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو خود پابند ہے تو اس کو پابند کرنے والا اس سے بڑا ہوگا، اسی لیے کہا کہ آسمان وزمین اور یہ ساری چیزیں جس نے ان کو بنایا ہے، اصلاً وہی رب ہے، اس کو سمجھنا چاہیے، اور تم لوگ جو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو رب بنارہے ہو، یہ خود تمہاری گمراہی کی بات ہے، اور میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں، یعنی میں توحید کی اس حقیقت کو سمجھ گیا ہوں، اس کی گواہی دیتا ہوں، اس کا مجھے پورا یقین ہے کہ یہ تو خدا ہو ہی نہیں سکتے، یہ قابل پرستش ہو ہی نہیں سکتے، بلکہ جس نے ان کو بنایا ہے اور پیدا کیا ہے، وہی قابل پرستش ہوگا۔

جرأت مندانہ اقدام اور نصرت خداوندی

﴿وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ☆ فَجَعَلَهُمْ جُذَاذاً إِلَّا كَبِيراً لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ☆قَالُوا مَن فَعَلَ هَذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ☆قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ

لَـهُ إِبْـرَاهِيـمُ☆قَـالُـوا فَـأْتُـوا بِـهِ عَلَى أَعْيُنِ النَّـاسِ لَعَلَّهُمْ
يَشْهَـدُون☆قَـالُـوا أَأَنتَ فَعَلْتَ هَذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيم☆قَالَ
بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ☆ فَرَجَعُوا
إِلَـى أَنـفُسِهِـمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنتُمُ الظَّالِمُون☆ثُمَّ نُكِسُوا عَلَى
رُؤُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هَؤُلَاء يَنطِقُون☆قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِن
دُون اللَّـهِ مَـا لَا يَـنفَعُكُمْ شَيْئاً وَلَا يَضُرُّكُم☆أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا
تَـعْبُـدُونَ مِـن دُون اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُون☆قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا
آلِهَتَـكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ☆ قُـلْـنَا يَا نَارُ كُونِيْ بَرْداً وَسَلَاماً
عَـلَـى إِبْـرَاهِيـمَ☆وَأَرَادُوا بِـهِ كَيْـداً فَـجَـعَـلْـنَـاهُـمُ
الْأَخْسَـرِيْـن☆وَنَـجَّيْنَاهُ وَلُوطاً إِلَى الْأَرْضِ الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا
لِـلْـعَـالَمِيْن☆وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً وَكُلّاً جَعَلْنَا
صَـالِـحِيْـنَ☆وَجَـعَـلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ
فِـعْـلَ الْـخَيْـرَاتِ وَإِقَـامَ الـصَّلَاةِ وَإِيْتَـاء الـزَّكَاةِ وَكَانُوا لَنَا
عَابِدِيْنَ☆وَلُوطاً آتَيْنَاهُ حُكْماً وَعِلْماً وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ
كَـانَـت تَّـعْـمَـلُ الْـخَبَـائِثَ إِنَّهُـمْ كَـانُـوا قَـوْمَ سَـوْءٍ
فَاسِقِيْن☆وَأَدْخَلْنَاهُ فِيْ رَحْمَتِنَا إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِيْن﴾

(الأنبياء:۵۷–۷۵)

(اوراللہ کی قسم میں تمہارے چلے جانے کے بعد تمہارے بتوں سے ضرور ایک چال چلوں گا، پھر انہوں نے ان سب کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا سوائے ان میں کے بڑے کے تاکہ وہ سب اسی سے رجوع کریں، انہوں نے کہا کہ کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے، کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک شخص کوسنا ہے جس کا نام ابراہیم ہے وہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں، تو لوگوں نے کہا کہ ان کو لوگوں کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ ان

سے پوچھا جائے، چنانچہ انہوں نے معلوم کیا کہ کیا تم نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے اے ابراہیم، انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے اس بڑے (بت) نے یہ کیا ہوگا تو تم انہیں سے پوچھ لو اگر یہ بتائیں، بس اس کے بعد وہ اپنے آپ میں غور کرنے لگے اور کہا کہ واقعی تم خود ہی غلط کام کررہے ہو، پھر ان سب نے اپنا سر جھکا لیا اور کہا کہ تم جانتے ہی ہو کہ یہ نہیں بول سکتے، (حضرت ابراہیم) نے کہا؛ تو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، یہ تو تمہارے لیے بڑے ہی افسوس کی بات ہے اور جس کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو کیا تم سمجھتے نہیں، وہ کہنے لگے کہ ان کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو اگر تم ایسا کرسکتے ہو، چنانچہ ہم (اللہ تعالیٰ) نے آگ کو حکم دیا کہ تم ٹھنڈک اور سلامتی بن جاؤ ابراہیم پر، اور انہوں نے ان کے متعلق بڑے ہی مکر وفریب سے کام لیا تھا تو ہم نے انہیں کو الٹے خسارے میں ڈال دیا، اور ہم نے ان کو اور لوط کو بچا کر اس زمین کی طرف پہنچا دیا جہاں ہم نے سارے عالموں کے لیے برکت رکھی، اور ہم نے ان کو اسحاق اور مزید بطور فضل یعقوب دیئے اور ہر ایک کو ہم نے بہت اچھا بنایا، اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا وہ ہمارے حکم سے راستہ بتاتے ہیں اور ہم نے ان کے پاس اچھے کاموں کی وحی بھیجی یعنی نماز پڑھنے کی، زکاۃ دینے کی، اور وہ ہماری عبادت کرنے والے بنے، اور لوط کو بھی ہم نے سمجھ اور علم عطا کیا اور ہم نے ان کو (لوط کو) اس بستی سے نجات دلائی جو کہ بہت برے برے کام کرتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ بہت ہی برے تھے اور ہم نے ان کو (لوط علیہ السلام کو) اپنی رحمت کے دائرہ

میں داخل کیا، بے شک وہ بڑے نیک لوگوں میں تھے)

توحید پر استقامت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی سمجھ سے توحید کے اس نقطہ نظر کو سمجھنے کے بعد صرف یہی نہیں کہ اس بات کو مان لیا، بلکہ ماننے کے بعد اس پر قائم ہو گئے، اور اس پیغام کے مخالف لوگوں سے مقابلہ شروع کر دیا، انہوں نے طے کر لیا کہ اب دوسروں کو بھی اس بات کا ہمیں قائل کرنا ہے، لیکن سوچا کہ کیسے قائل کریں؟ جب ہم نے خود توحید کی حقیقت کو سمجھا تھا تو وہ ہماری خود کی جستجو تھی، لیکن اب ان لوگوں کو اپنے اس ذہن کی ترتیب پر کیسے لائیں، اس لیے جو بات عام عقل میں آتی ہے وہی انہوں نے اختیار کی، اتفاق یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد ان کے یہاں ایک میلہ تھا، جس میں ہر سال ان کی قوم کے لوگ شرکت کرتے تھے، چنانچہ جب سب لوگ اس میلہ میں شرکت کے لیے جانے لگے تو انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا ہم نہیں جائیں گے، اور اس کے بعد انہوں نے ایک پلان بنایا کہ بتوں کو توڑ ڈالا جائے، اور بڑے بت کو باقی رکھیں، اور اسی کی گردن میں کلہاڑی لٹکا دیں، تا کہ یہ محسوس ہو کہ یہ حرکت اسی بڑے بت کا کرتوت ہے، یعنی بالکل ایسا منظر بنا دیا کہ قوم کے لوگوں کو زبان حال سے قائل کر دیں، چنانچہ اسی کے مطابق انہوں نے کیا، اب جب قوم کے لوگ میلہ سے واپس ہوئے تو انہوں نے عبادت خانہ میں جا کر دیکھا کہ سارے بت ٹوٹے ہوئے ہیں، اس پر پوری بستی میں چرچا شروع ہو گئی کہ کس شخص نے ہمارے بتوں کو توڑا ہے، بالآخر حضرت ابراہیم علیہ السلام پکڑ کر لائے گئے، اور ان سے سب کچھ پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا کہ ہم سے کیا پوچھتے ہو؟ اپنے اس بڑے بت سے پوچھو، جن سے تم مانگتے ہو کہ ان دیگر بتوں کو کس نے مارا اور توڑا ہے، اس پر وہ لوگ گھبرائے کہ یہ واقعی بہت سخت بات تھی، یہ ایسی بات ہے کہ اس کو عقل فوراً تسلیم کرتی ہے، لیکن وہ لوگ عقل و منطق کو چھوڑ کر غصہ کرنے لگے اور کہا کہ یہ بدتمیز ہے، اور پھر یہ سوچ کر کہ یہ تو فتنہ مچا

دے گا، اس کی وجہ سے اس شہر کے اندر ایک آفت آجائے گی، جس طرح یہ بات کر رہا ہے، اس طرح معلوم نہیں کتنوں کو بہکا دے گا، اور یہاں ایک تغیر لے آئے گا، جن کو ہم پوجتے ہیں ان کو یہ پوجنا بند کرا دے گا، اس لیے اس شخص کو زندہ رہنا ہی نہیں چاہیے، بلکہ اس کو سرے سے ختم کر دینا چاہیے، آگ میں جلا دینا چاہیے۔

آگ میں جلا دینے کا مسئلہ یہ ہے کہ عام طور پر شرک والے آگ کو بھی خدا کی طرح سمجھتے ہیں، اسی لیے اس کو پوجتے بھی ہیں، مجوسیوں کے یہاں باقاعدہ آگ ہی پوجی جاتی ہے، اسی طرح کچھ ہندؤں کے یہاں بھی باقاعدہ آگ کی عبادت ہوتی ہے، اور مردہ کو آگ میں جلایا جاتا ہے، وہ لوگ دفن نہیں کرتے ہیں، تو ان لوگوں کے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانا کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی کہ جس سے آدمی سوچے کہ آگ میں جلایا جائے، گویا جس طرح مسلمانوں کا آگ میں جلائے جانے کے متعلق تاثر ہوتا ہے وہ دوسروں کا نہیں ہوتا ہے، اسی لیے فسادات میں عام طور پر ایسا ہوا ہے کہ لوگوں کو آگ میں جلایا گیا ہے۔

اعلان براہیمی

اوپر مختصراً ذکر ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت توحید پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ دیکھو! ہم ان بتوں کو نقصان پہنچائیں گے، ان کے لیے ہم ایک ایسی ترکیب و تدبیر کریں گے، جس سے ہر کسی کو ان بتوں کی حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ یہ کتنی طاقت رکھتے ہیں، گویا ہم یہ دکھا دیں گے کہ ان کی طاقت کتنی ہے، اور یہ کام جب کریں گے جب تم میلہ میں جا رہے ہو گے، جب تم وہاں سے واپس آؤ گے تو دیکھنا کہ ہماری کیا تدبیر ہے، جن کو تم نے خدا سمجھ رکھا ہے، جن کے سامنے تم لرزتے ہو، ان سے مانگتے ہو، اور ڈرتے ہو، ان کا حال دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے، چنانچہ قوم کے لوگوں کے میلہ میں جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ایک کلہاڑی لے گئے اور اس سے انہوں نے سب کو توڑ کر

www.abulhasanalinadw.org

رکھ دیا، پھر ان میں جو بہت بڑا بت تھا، اس کو چھوڑ دیا، اس کو نہیں توڑا، اور مقصد یہ بیان کیا تا کہ باز پرس کے وقت یہ کہہ سکیں کہ اپنے اسی بڑے سے پوچھئے کہ بتوں کے ساتھ کیا ہوا، یہ سب بت کیوں مارے گئے، ایسا تو نہیں ہے کہ تم ہی نے ان کو مار دیا؟ چنانچہ جب وہ لوگ واپس آئے تو انہوں نے بت خانے میں آ کر دیکھا کہ سب بت ٹوٹے پڑے ہوئے تھے اور بس ایک ہی کھڑا تھا، لہٰذا ان لوگوں نے معلوم کیا کہ یہ حرکت کس نے کی؟ کس نے ہمارے خداؤں کو توڑ دیا اور مار دیا؟ تو کچھ لوگوں نے کہا جنہوں نے حضرت ابراہیم کی توحید پر مبنی بات سن لی تھی، جب انہوں نے میلہ میں جانے سے پہلے لوگوں سے کہا تھا کہ ہم ان بتوں کے ساتھ ایک ترکیب کریں گے، دیکھنا تمہارے بتوں کا کیا ہوتا ہے، چنانچہ ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے تو ایک شخص کو سنا ہے جو ابراہیم ہیں، وہی ایسی باتیں کر رہے تھے، ممکن ہے انہوں نے ہی یہ سب کچھ کیا ہو، غرض کہ بات اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان کو بلایا جائے، تو انہوں نے کہا کہ ان کو لوگوں کے سامنے پکڑ کر لاؤ، تا کہ ان سے بیان لیا جائے اور ان سے پوچھا جائے، اور سب لوگ یہ منظر دیکھیں اور اس بات کے گواہ رہیں کہ ان سے کیا بات ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام طلب کیے گئے اور ان سوال کیا گیا کہ اے ابراہیم! کیا تم نے بتوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا: یہ جو تمہارا بڑا بت ہے اس نے کیا ہوگا، اس لیے تم لوگ اس سوال کا سچا جواب انہیں بتوں سے پوچھ لو، اگر یہ بتا سکیں تو ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے مارا اور توڑا ہے؟ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات سن کر وہ اپنے دل میں غور کرنے لگے کہ یہ تو ایسی بات کہہ رہے ہیں کہ اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے، یہ تو کہتے ہیں کہ تم اپنے انہیں بتوں سے پوچھ لو، گویا جن سے ہم نذر و نیاز مانگتے ہیں، جن کے سامنے ہم اپنے مطالبے رکھتے ہیں، انہیں سے یہ پوچھیں کہ تم کو کس نے مارا؟ چنانچہ اس غور و فکر کے بعد انہوں نے سر جھکا لیا اور سوچا کہ واقعی ہم ہی لوگ غلط راہ پر ہیں، ہمارا کام تو سراسر بے عقلی ہے، اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، چنانچہ انہوں نے دبے لہجہ کہا کہ

www.abulhasanalinadw.org

اے ابراہیم! تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ بول نہیں سکتے، بس ان کا یہ کہنا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شروع ہونا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ تب تو پھر بڑے ہی افسوس کی بات ہے، تم جس کی عبادت کرتے ہو وہ بولنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے، نہ وہ نفع نقصان پہنچانے پر قادر ہیں، جب ان کا یہ حال ہے تو پھر ان کی عبادت میں تم کیوں مست ہو؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات بنا کر ریٹائرمنٹ لے لیا ہے، اللہ تعالیٰ کائنات بنا کر فارغ ہو گیا ہے، اس نظام عالم کو لوگوں کے سپرد کر دیا ہے کہ اب تم حکمرانی کرو، چاند، ستارے، سورج، درخت، دریا کے سپرد کیا ہے اور اللہ ریٹائر ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تب تو تمہارے لیے بڑے افسوس کی بات ہے، بظاہر تم بڑے عقل مند ہو، بڑی عالمانہ باتیں کرتے ہو، اور تم اتنا تمدن چلا رہے ہو، آسمان تک جارہے ہو، لیکن اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ جو چیز بالکل بے اثر ہے، جو خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتی، اسی کی عبادت میں لگے ہو، اور پھر یہ سب کس کو چھوڑ کر کر رہے ہو؟ اس کو جس کو تم سب سے بڑا مانتے ہو، مگر افسوس کہ پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

اس مرحلہ کے بعد ان کی قوم غصہ سے بھر گئی، ان میں جاہلانہ حمیت آ گئی، انہوں نے کہا کہ یہ شخص ہمارے بتوں کے متعلق ایسی تیز باتیں کر رہا ہے، یہ گستاخ ہے، اس کو مارو، چنانچہ سب غصہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ ان کو جلا دو، ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو آگ میں ڈال کر جلا کر ختم کر دو، اس طریقہ سے تم اپنے خداؤں کی مدد کرنے والے شمار کیے جاؤ گے، جن کی انہوں نے توہین کی اور بدتمیزی کی ہے، ان کا یہی علاج ہے کہ ان کو جلا دو، اور اپنے بتوں کی، اپنے خداؤں کی تم مدد کرو، اگر تم ایسا کر سکو تو کرو۔

ان کی اس سازش کو طشت از بام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سب اپنی سمجھ سے کیا، اور صرف سمجھ سے ہی نہیں بلکہ جرأت کر کے اپنی قوم سے لڑ گئے، اور اپنے کو خطرہ میں ڈال دیا، یہ معمولی بات نہ تھی، یہ واقعہ بیان کرنے میں تو آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن پوری قوم سے لڑ گئے، اور ایسی بات پر لڑے کہ جس میں ان کے اندر مذہبی لحاظ سے غصہ پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں

www.abulhasanalinadw.org

تھی، تو اللہ تعالیٰ کی مدد آئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے آگ کو حکم دیا کہ تیری جلانے کی جو خصوصیت ہے وہ ختم ہو جائے، اور اب تو ٹھنڈی خصوصیت کی ہو جا، یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ نے آگ کو یہ حکم دے دیا کہ تم ابراہیم کو جلا نہیں سکتیں، اس وقت تمہارے اندر جلانے کی خصوصیت ختم، تم میں ٹھنڈک کی خصوصیت شروع، چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو یہی ہوا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ وہ جل نہیں رہے ہیں، بلکہ اس آگ میں بہت خوش ہیں، کیونکہ خدا کا فرمان جاری ہو چکا تھا کہ اے آگ تم ٹھنڈک اور سلامتی بن جاؤ ابراہیم کے لیے، ان کے لیے ٹھنڈک پیدا کرو۔

خدا کی مدد

غرض کہ جب یہ طے ہو گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلا دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قبول کر لیا تھا، اس لیے آگ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوئی، یہاں اس واقعہ میں غور کا پہلو یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی ان صلاحیتوں سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو دی ہیں، ان سے اس نے حق بات کو پہنچانا، نہ کہ کسی کے کہنے اور کسی کے سمجھانے سے، بلکہ خود اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا، گویا اس سے ہر ایک کو یہ سبق دے دیا گیا کہ تم اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے دیکھو، تم بھی یقیناً حق تک پہنچ سکتے ہو، بشرطیکہ تم اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرو، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس حق تک پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی، ظاہر ہے اگر ان کو آگ میں جلا دیا جاتا تو پھر توحید کی وہ بات ختم ہو جاتی، لوگوں کے ہدایت کی جو صورت پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہو جاتی۔

ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے چلتی ہے، چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ تمہارے جلانے کی صفت ختم ہو جائے، اور اس کے عوض تم میں ٹھنڈک کی صفت پیدا کی جاتی ہے، لہٰذا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو وہ خوش نظر آئے، اور ان کی قوم کے لوگ

www.abulhasanalinadw.org

بہت پریشان ہوئے کہ اب کیا کر سکتے ہیں، یہی کر سکتے تھے، مگر اس سے کچھ نہ ہوا، اس لیے پھر ان لوگوں نے یہی کہا کہ ہمارے علاقہ سے ان کو نکالو، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہی طے کیا کہ اب ہم ان میں نہیں رہ سکتے، چنانچہ وہاں سے وہ شام چلے گئے، اور وہاں انہوں نے اپنا دعوتی کام کیا، ہدایت کا کام کیا، ان کے ساتھ ان کے بھتیجے حضرت لوط بھی تھے، جو ان پر ایمان لے آئے تھے وہ بھی ساتھ ہو گئے تھے، ان کو انہوں نے وہاں ایک قریب کے علاقہ میں بھیج دیا، جہاں ایسی قوم آباد تھی، جو بدمعاشیوں اور شرک میں مبتلا تھی، انہوں نے وہاں بڑی محنت سے دعوت کا کام کیا، اور وہاں ان کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا قرآن مجید میں دوسری جگہ اس کی تفصیل موجود ہے، خلاصہ یہ کہ آخر میں ان کی قوم پر عذاب آیا۔

خواص اشیاء کی حقیقت

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اگر وہ صرف کسی چیز کو کہہ دے کہ "ہو جا" تو وہ چیز ہو جاتی ہے، لیکن اس نے سبب و مسبب کا ایک نظام بنایا ہے، اسی لیے ہر چیز ذرائع اور اسباب سے ہوتی ہے، لیکن سارے اسباب اور سارے ذرائع کے پیچھے اللہ تعالیٰ ہی کا ہاتھ ہے، خواہ وہ ذریعہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر چیز کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی ہی عظمت و بڑائی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو خصوصیات دی ہیں، ان سے آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جب انسان میں ایسی خصوصیات ہیں کہ وہ موقع و محل کو سمجھتا ہے، اور موقع محل کے لحاظ سے اپنی بات کہتا ہے، تو اس کے مقابل اللہ تعالیٰ تو ہر طرح کے حالات سے بخوبی واقف ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کون سی بات کو کس طریقہ سے کہنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت

یہ ساری کائنات اللہ کی بنائی ہوئی ہے، اور ہر چیز کے جو خواص ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اور اللہ نے ان کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا ہے، یہ تو مشرکین کا عقیدہ ہے کہ بنا کر چھوڑ دیا ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ غور نہ کرنے والوں

سے بھی یہ غلطی ہوتی ہے کہ ذرائع یا وسائل کو اصل سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ جو ذرائع و وسائل ہیں وہ سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، اور یہ اللہ نے بنا کر چھوڑ نہیں دیئے ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے عمل کرتے ہیں، چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اللہ کے کرنے سے ہوتی ہے، قرآن مجید میں اس کو کئی جگہ کہا گیا ہے کہ کوئی بھی بات ہو چھوٹی ہو یا بڑی، سب ہمارے علم سے ہوتی ہے، کوئی چیز ہمارے علم و اختیار سے باہر نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ جو نظام بنایا ہے تو اس میں ذرائع کو چلایا ہے، لیکن ذرائع اللہ تعالیٰ ہی پیدا فرماتا ہے اور ان کے اندر تاثیر بھی اللہ ہی پیدا فرماتا ہے، دوا خود سے فائدہ نہیں کرتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے فائدہ کرتی ہے، دوا میں خود اپنی کوئی تاثیر نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں میں تاثیر رکھ دی ہے وہ تاثیر اسی حساب سے کام کرتی ہے جس حساب سے اللہ نے رکھی ہے، اور پھر یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ مستقل دیکھ بھی رہا ہے کہ یہ تاثیر ہو رہی ہے یا نہیں، لہٰذا اگر وہ چاہے تو اس بات پر پوری قدرت رکھتا ہے کہ تاثیر کو روک لے، اس کے متعدد واقعات بھی ملتے ہیں کہ وہ بات جو بالکل یقینی تھی وہ عمل میں نہ آئی، اللہ تعالیٰ نے اس کو روک دیا، اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے وہ بظاہر ہماری نظر میں نہیں آتا، اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ نہیں کر رہا ہے، آپ غور کیجئے تو یہ کمزوری ہم مسلمانوں میں بھی آ گئی ہے کہ ہم اس پر زیادہ توجہ نہیں کرتے، ہم اشیاء کو اصل سمجھنے لگتے ہیں، اور اشیاء کے جو خواص ہیں ان کو اصل سمجھنے لگتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ یہ خواص اللہ کی اجازت سے کام کرتے ہیں، بعض وقت وہ دوا جو بالکل یقینی طور پر کامیاب ترین ہوتی ہے وہ کام نہیں کرتی، بڑا حاذق آدمی ہوتا ہے، لیکن اس کے علاج سے فائدہ نہیں ہوتا۔

مشرک قوم کی سازش

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی سازش کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس طرح ختم کرنے کی تدبیر کے ذریعہ بڑے ہی مکر و فریب سے کام لیا تھا، تا کہ انھوں نے جو فکر اور ایک

خیال دیا تھا وہ خیال ختم ہو جائے، یعنی توحید کا آوازہ بلند ہوا تھا وہ کچل کر رکھ دیا جائے، اگر وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلا دیتے تو کون اس کے بعد ہمت کرنے والا ہوتا جو توحید کی بات کرتا، لیکن یہ خدا کا کرم ہوا کہ اس نے ان کو بچایا، اور بجائے ان کے حضرت ابراہیم کو گھاٹے میں ڈالنے کے، اللہ تعالیٰ نے انہیں کو خسارے میں ڈال دیا، وہ اپنی سازش میں بری طرح ناکام ہوئے۔

ہجرت کا حکم

اس سخت آزمائش کے بعد قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بستی سے ہجرت کا حکم فرمایا، اسی لیے فرمایا گیا کہ ہم نے ان کو ان لوگوں سے نجات دلا دی، ظاہر ہے کہ جب وہ لوگ ان کے پیچھے پڑے رہیں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چلنے نہیں دیں گے اور ہر وقت پریشان کریں گے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے ان کی وہاں سے ہجرت کرادی، روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق چھوڑ کر شام چلے گئے اور ان کے ساتھ ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام بھی چلے گئے، جنہوں نے ان کا دعوت کے کام میں ساتھ دیا تھا۔

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق بتایا گیا کہ ان کو بھی ہم نے سمجھ اور علم عطا کیا اور نبوت عطا کی، حضرت لوط علیہ السلام شام کے علاقہ میں ایک بستی میں جا کر دعوت کے کام کے لیے رکے تھے، اس بستی میں بڑی گندی حرکتیں ہوتی تھیں، حضرت لوط علیہ السلام ان لوگوں کو سمجھاتے تھے، مگر وہ نہیں مانتے تھے، جب وہ بالکل عاجز آگئے تو ان کی قوم پر عذاب آیا جس کی پوری تفصیل ہے، مذکورہ آیات میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے ان کو (لوط کو) اس بستی سے نجات دلائی جو کہ بہت برے برے کام کرتی تھی اور وہ لوگ بہت ہی برے تھے، فسق و فجور میں مبتلا تھے، چنانچہ ہم نے ان سب کا

براحشر کیا اور ہم نے ان کو اپنی خاص رحمت کے دائرہ میں داخل کیا، کیونکہ وہ بڑے ہی نیک لوگوں میں سے تھے۔

مبارک زمین

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس زمین کی طرف ہجرت کی اس کے متعلق فرمایا گیا کہ ہم نے ان کو بچا کر اس زمین کی طرف پہنچا دیا، جہاں ہم نے سارے عالموں کے لیے برکت رکھی، یعنی جہاں بیت المقدس ہے، جہاں بنی اسرائیل رہے، اور جہاں حضرت ابراہیم و حضرت اسحاق، یعقوب یہ سب رہے، جہاں اللہ کی بڑی عبادت ہوتی رہی اور بہت دعوت کا کام ہوا، دیکھا جائے تو مکہ مکرمہ اور حجاز کے بعد وہی جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ اللہ کی رحمتیں اور اس کا کرم نازل ہوا ہے۔

انعاماتِ الٰہیہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام لا ولد تھے، چنانچہ انہوں نے اللہ سے دعا کی تو بڑھاپے میں اولاد ہوئی، اور اللہ نے بیٹا ہی صرف نہیں دیا، بلکہ بیٹے کے بعد پوتا بھی دیا، اسی کے متعلق مذکورہ آیت میں فرمایا گیا کہ ہم نے صرف اسحاق ہی نہیں دیئے بلکہ یعقوب بھی دیئے، اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے بہت صالح یعنی اچھا بنایا، اور ان کو ایسا بنایا کہ وہ امام یعنی قائد ہوئے اور ہمارے حکموں کی رہنمائی کرتے تھے، ہم نے ان کے پاس اچھے کاموں کی وحی بھیجی کہ اچھے کام کیا ہوتے ہیں، کیسے کیے جاتے ہیں، نیز ہم نے وحی کے ذریعہ نماز پڑھنے، زکاۃ دینے کی تعلیم دی، اور وہ ہماری عبادت کرنے والے بنے۔

شرفاء کا خاندان

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کوئی اولاد نہ تھی، چنانچہ بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اولاد سے نواز دیا، اور ایک خوبصورت بیٹا عطا کیا، اور پھر بیٹے کو بھی بیٹا یعنی حضرت

www.abulhasanalinadw.org

ابراہیم علیہ السلام کو پوتے سے بھی نوازا، اور وہ بھی ایسا کہ اس کے بعد آگے کی نسلوں تک دعوت اور اللہ کی توحید کا کام پوری ہمت وکوشش سے جاری رہا، جس کے نتیجہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل نہایت ہی مبارک نسل سمجھی گئی، ایک مرتبہ حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ دینی لحاظ سے عزت اور شرافت کس میں ہے؟ فرمایا؛ حضرت یوسف علیہ السلام میں، وہ خود بھی نبی، باپ بھی نبی، دادا بھی نبی، پردادا بھی نبی، گویا یہ نبیوں کا ایک سلسلہ ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی، ان کے بیٹے اسحاق علیہ السلام نبی، پھر ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام بھی نبی، اور پھر ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام بھی نبی، لہٰذا ظاہر ہے کہ جو عزت ان کو حاصل ہوئی وہ کس کو ہوسکتی ہے؟(۱)

قصہ ابراہیمی کا پیغام

اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمونہ بنایا ہے، اور یہ پیغام دیا ہے کہ انسان کو ایسا ہونا چاہیے، یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے تم میں جو صلاحیتیں رکھی ہیں، دل و دماغ اور احساسات دیئے ہیں، سمجھ دی ہے، غرض کہ ساری ضرورت کی چیزیں دے دی ہیں، ان سے تم اللہ کے حکم کے مطابق فائدہ اٹھاؤ، مگر انسان ان میں سے کسی سے بھی سبق نہیں لینا چاہتا، وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتا کہ یہ ساری کائنات یوں ہی نہیں ہے، اور یہ یوں ہی نہیں چل رہی ہے، بلکہ اس کو ایک چلانے والی ذات موجود ہے، مگر وہ اس پر غور نہیں کرتا، اسی لیے قرآن مجید میں اس کے متعلق کہا گیا کہ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ یہ پتھر انہیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ درخت کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ تمہاری کتنی بے عقلی کی بات ہے کہ تم اس کو نہیں سمجھتے، ان کے اس حقیقت کو نہ سمجھنے کے متعلق بنیادی اسباب میں قرآن مجید نے ذکر کرتے ہوئے بعض جگہ بتایا ہے کہ اس کا بنیادی سبب تکبر ہے کہ ہم دوسرے کی بات کیوں مانیں، اسی لیے وہ لوگ غور کرنے کے لیے بھی تیار نہیں، کیونکہ غور کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ماننا پڑے گا، لہٰذا غور ہی نہیں کریں گے، چاہے کتنی ہی عمدہ

---

(۱)البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ لقد کان فی....: ۳۳۹۰

www.abulhasanalinadw.org

طریقہ پر بات کہی جائے، لیکن اس کو نہیں مانتے، اس لیے کہ دل تیار نہیں ہے، گرچہ دماغ مان رہا ہے، لیکن دل تیار نہیں ہے، اسی لیے قرآن مجید میں یہودیوں کے متعلق فرمایا گیا کہ یہودی حضور ﷺ کے نبی صادق ہونے کو اس سے زیادہ جانتے ہیں جتنا اپنے لڑکوں کو جانتے ہیں، یہ صاف صاف قرآن مجید میں ہے کہ اپنے لڑکوں کو اتنا نہیں پہچانتے جتنا یہ جانتے ہیں کہ حضور ﷺ سچے نبی ہیں، لیکن پھر بھی نہیں مانتے ہیں، جب کہ آپ ﷺ کی ساری باتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے مطابقت رکھتی ہیں، اور حضرت موسیٰ کو یہودی مذہب کے لوگ نبی مانتے ہیں، ان کو موسوی شریعت پر چلنے کا دعویٰ ہے، اور یہ نبی بھی اسی کے مطابق بات کہہ رہے ہیں، مگر پھر بھی ان کا حال یہ ہے کہ اس کو غلط کہہ رہے ہیں، صرف غلط ہی نہیں کہا بلکہ اس حد تک بڑھ گئے کہ کہنے لگے کہ مشرکین کا مذہب ان کے مذہب سے زیادہ بہتر ہے، درحقیقت ان تمام جرأتوں پر آمادہ کرنے میں سب سے زیادہ معاون چیز ان کا تکبر ہے کہ ہم دوسرے کی بات کیوں مانیں، اور یہ تکبر ایسی چیز ہے جو انسانوں کو بہت نقصان پہنچاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تکبر کو بہت برا قرار دیا ہے، شیطان کو جو تباہی اور رسوائی ملی ہے وہ تکبر ہی کی وجہ سے ملی ہے، اس نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام مٹی کے بنائے گئے ہیں، اور ہم آگ کے بنے ہوئے ہیں، پھر بھی ہم ان کے سامنے جھکیں، جب کہ آگ مٹی سے بلند ہوتی ہے، حالانکہ آگ کا بنا ہو یا مٹی کا، غور کا مقام یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں، اور جب اس کی بنائی ہوئی ہیں تو ان کو چاہیے کہ اللہ کے حکم پر چلیں، غرض کہ اللہ تعالیٰ نے تکبر کو بہت زیادہ ناپسند کیا ہے، فرمایا ہے کہ کبریائی میری چادر ہے، اگر کوئی میری چادر چھینے گا تو میں اس کو سخت سزا دوں گا، اسی لیے تواضع کو بہت اہمیت دی گئی ہے، یعنی انسان کا اپنے کو چھوٹا اور بے حقیقت سمجھنا، اصلاً قادر مطلق اور مالک حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے نمونہ بنا کر پیش کیا، اسی لیے

www.abulhasanalinadw.org

اس کو ایسی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ معمولی سمجھ والا آدمی بھی سمجھ جائے، انہوں نے اس بات پر غور کیا کہ لوگ جن چیزوں کی پوجا کرتے ہیں، وہ کیسے خدا ہوسکتی ہیں، پھر دیکھا کہ چاند بہت بلندی پر ہے، ستارہ بہت بلندی پر ہے، تو کیا یہ خدا ہوسکتا ہے؟ لیکن پھر ذہن میں بات آئی کہ یہ کیسے ہوگا، یہ تو خود ایک نظام کا پابند ہے، ہم اس کو دیکھ رہے ہیں کہ یہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرسکتا، بلکہ یہ تو صرف ایک لائن پر چل رہا ہے اور اسی کا پابند ہے، تو جو دوسرے کا پابند ہے، اور اس کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہے تو وہ دوسرے کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے، پھر غور کیا کہ سورج خدا ہوسکتا ہے، جو چاند سے بھی بڑا ہے؟ یہاں پر غور کے بعد ذہن میں بات آئی کہ نہیں، یہ سب خواب وخیال کی باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند ہے، خدا ان سب چیزوں سے بلند چیز ہے، اسی کے ہاتھ میں ہدایت ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ ہم کو ہدایت نہ دے تو ہم کو ہدایت نہ ملے گی، یہاں غور کی بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہدایت کو فوراً اللہ تعالیٰ کی توجہ سے جوڑ دیا۔

اگلی بات

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آگے آیات میں ان سارے نبیوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کی الگ الگ خصوصیات ہیں، مختلف نبیوں کے مختلف حالات و خصوصیات ہیں، بعض نبی ہیں جو بہت سخت بیماری سے گزرے، اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمائش کی اور ان کو سخت بیماری سے گذارا، سخت نقصانات سے گذارا، وہ بھی اس طرح کہ اس کے بعد آدمی بالکل اپنے کو بہت ہی نقصان میں سمجھے، پھر انہوں نے اللہ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور یہ دکھایا کہ دیکھو ہم سخت سے سخت مصیبت کو دعا سے دور کرسکتے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ نے مثال دی اور حضرت یونس علیہ السلام کی مثال دی، ان کا معاملہ بھی قابل ذکر تھا، یہ گرچہ ایک نبی تھے لیکن انسان ہونے کے ناطے ان سے ایک غلطی ہوگئی، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ان کی قوم پر عذاب کے آنے کا وعدہ تھا، جس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو ان کو شرمندگی محسوس ہوئی، اور انہوں نے سوچا کہ نہ جانے میری قوم مجھ سے کیا کہے گی؟ اس لیے وہ علاقہ چھوڑ کر چلے گئے، اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ عمل ناپسند ہوا، اس لیے گویا اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا سے گذارا، اس سورت میں ان کا واقعہ اسی لیے بیان کیا گیا کہ تمام انسانوں کو یہ بتا دیا جائے کہ سمجھ لو جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو سزا دے سکتا ہے، لہٰذا کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم مستثنیٰ ہیں، اس لیے کہ ہم بہت نیک ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ دکھا دیا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو جو شرمندگی کا ایک احساس ہوا تھا، اس پر ان کو اپنا علاقہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس عمل پر گرفت فرمائی، اور پھر یہ بھی بتایا کہ جب انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی، گویا اتنی بڑی سزا کے بعد بھی توبہ قبول ہوگئی، غرض کہ یہ سب باتیں اور واقعات ہم انسانوں کو یہ بتانے کے لیے ہیں کہ اے لوگو! تم اللہ کے معاملہ میں ان باتوں کو سمجھو، وہ تمہاری توبہ قبول فرماتا ہے، اور بعض وقت وہ تمہاری تنبیہ کرتا ہے، اسی طرح بعض وقت وہ سخت سے سخت مرحلہ میں انسان کی ایسی مدد کرتا ہے جس پر آدمی کو تعجب ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر آگ کو ٹھنڈک بنا دیا، یہ واقعہ قرآن مجید میں اسی لیے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے آدمی اس حقیقت کو سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان کا جو تعلق ہے اس کی کیا کیفیات ہونی چاہئیں، اور کیا حساب ہونا چاہیے۔

حضرت نوح علیہ السلام

﴿وَنُوحاً إِذْ نَادَى مِن قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ☆وَنَصَرْنَاهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (الأنبياء: ٧٦-٧٧)

(اور نوح کو یاد کرو جب انہوں نے پہلے ہی پکارا تو ہم نے ان کی دعا کو قبول کیا اور ان کو اور ان کے گھر والوں کو سخت مصیبت سے نجات دی، اور ہم نے ان کی مدد کی ان لوگوں کے مقابلہ میں جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، بلاشبہ وہ بہت ہی برے لوگ تھے، اسی لیے ہم نے ان سب کو ڈبو دیا)

اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ کو پکارا، اسی کے متعلق فرمایا گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو یاد کرو اور ان کے تذکرہ کو دیکھو، انہوں نے پہلے ہی سے دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ کو پکارا تھا اور ہم نے ان کی دعا کو قبول کر لیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ جس طویل مدت تک حضرت نوح علیہ السلام نے دعوت کی راہ میں قربانیاں دی، اتنی لمبی مدت تک کسی اور کا ذکر نہیں آتا ہے کہ اس نے دعوت کا کام کیا ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اس وقت اللہ تعالیٰ سے فریاد کی جب وہ بالکل تھک گئے، اور ان کے امکان سے بات بالکل باہر چلی گئی، انہوں نے ساڑھے نو سو سال تک

www.abulhasanalinadw.org

لوگوں کو سمجھایا، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک لمبی عمر عطا فرمائی، اس سے خود سمجھا جا سکتا ہے کہ اتنے سالوں میں ان کو کیسے کیسے حالات پیش آئے ہوں گے، ان کو کیسا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا، لوگ ان کے ایسے پیچھے پڑے کہ غالباً ان کی یہ منزل آ گئی تھی کہ ان کو شہید کر دیا جائے، حضرت نوح علیہ السلام نے ان حالات کو سمجھ لیا کہ اب کوئی امکان نہیں ہے، ان میں جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، ان کے علاوہ اب کوئی اور ایمان لانے والا بظاہر نہیں ہے، ظاہر ہے اتنی لمبی مدت میں انہوں نے ہر ایک کو جان لیا ہوگا اور سمجھ لیا ہوگا، ہر ایک سے سابقہ پڑا ہوگا، چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عذاب آنے سے پہلے دعا کی۔

نبی کی دعا کے بعد

یہاں یہ بات یاد رہے کہ جب نبی عذاب کی دعا کر دیتا ہے کہ اے اللہ! اب گنجائش نہیں ہے، اب تو عذاب بھیج دے، تو فوراً عذاب نہیں آتا، بلکہ وقت لگتا ہے، اللہ تعالیٰ منظوری تو فوراً دے دیتا ہے کہ ٹھیک ہے ہم عذاب بھیجیں گے، لیکن کب بھیجیں گے یہ نبی کو نہیں بتایا جاتا ہے، چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے متعلق عذاب کی بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے منظور کر لی، لیکن بتایا جاتا ہے کہ چالیس سال بعد وہ غرق کیا گیا، اسی سے یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کو بھی انسان کی سطح پر رکھا ہے، اس کے لیے یہ نہیں کیا کہ اس کو فرشتہ کی سطح پر اللہ تعالیٰ پہنچا دے، بلکہ اس کے لیے وہی قانون رکھا کہ انسانوں میں انسان کی طرح برداشت کرنا پڑے گا، اسی لیے جب ایک نبی کو نبوت ملتی ہے، تو اس نبوت کو وہ بالکل اپنے میں جذب کر لیتا ہے، اس نبی کا وہی مزاج بن جاتا ہے، وہ بس اسی فکر میں رہتا ہے، اسی میں اپنے کو کھپاتا رہتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کام اس کے سپرد کیا ہے، اس کو نبی بالکل اوڑھ لیتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ انسان ہی ہے، چنانچہ پھر تھکتا ہے، پریشان ہوتا ہے، اور پھر جب اس کے نتائج سامنے آتے ہیں، تو اس کو آخر میں احساس ہوتا ہے کہ ہم تھک گئے، حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق سورۂ نوح میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے

کہتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم نے آہستہ سے بھی کوشش کی، ہم نے اعلان کے ساتھ بھی کوشش کی، ہم نے ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی، جتنے مواقع ہو سکتے ہیں، ہم نے وہ سب اختیار کیے، لیکن انھوں نے مان کر نہیں دیا، ان کو سمجھانے کا کوئی طریقہ ہم نے نہیں چھوڑا، ہم نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے ہر راہ اپنائی، لیکن انھوں نے سمجھ کر نہ دیا، لہٰذا آپ ان سب کو ختم کردیں، اور انہیں کو نہیں بلکہ ایسا ختم کریں کہ یہ بالکل مٹ جائیں، ورنہ ان میں سے کوئی زندہ رہ جائے گا تو اس کی اولاد بھی آئندہ کے لیے مصیبت بنے گی، اس لیے ان کو ختم ہی کردیجئے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کی مہر لگی، اور پھر ان کی قوم پر عذاب آیا، اسی کے متعلق فرمایا گیا کہ ہم نے ان کو اور ان کے گھر والوں کو نجات دی، یعنی وہ جس کرب اور مصیبت میں تھے، جس کی وجہ سے وہ بالکل تھک گئے تھے، اور بہت زیادہ پریشان ہوگئے تھے، ہم نے ان کو اس پریشانی سے نجات دی، یہاں عذاب کے ذکر کے علاوہ نجات دینے کا ذکر ہے، یعنی حضرت نوح علیہ السلام اتنے پریشان ہوگئے تھے کہ جب قوم پر عذاب آیا تو ان کو راحت ملی کہ یہ مصیبت ہم سے دور ہوئی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی مدد کی ان لوگوں کے مقابلہ میں جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ مجموعی اعتبار سے وہ بہت ہی برے لوگ تھے، چنانچہ ان کا انجام کار یہی ہوا کہ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے ڈبو دیا۔

www.abulhasanalinadw.org

حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام

﴿وَدَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ☆ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلّاً آتَيْنَا حُكْماً وَعِلْماً وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُودَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِينَ☆وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن بَأْسِكُمْ فَهَلْ أَنتُمْ شَاكِرُونَ☆وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِينَ☆وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَن يَغُوصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلاً دُونَ ذَلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حَافِظِينَ﴾ (الأنبياء: ۷۸–۸۲)

(اور داؤد اور سلیمان کو دیکھو جب وہ دونوں کھیتی کے سلسلہ میں فیصلہ کر رہے تھے، جس میں دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کو دیکھ رہے تھے تو ہم نے اس (معاملہ) کو سلیمان کو سمجھا دیا، اور ہم نے دونوں ہی کو سمجھداری اور علم سے نوازا، اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا وہ اور پرندے (ان کے ساتھ) تسبیح کرتے تھے اور کرنے والے ہم ہی تھے، اور ہم ہی نے ان میں زرہ بنانے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی تا کہ وہ تمہاری جنگوں میں تمہاری حفاظت کر سکے تو کیا تم شکر ادا کرتے ہو، اور سلیمان کے

www.abulhasanalinadw.org

لیے ہم نے تیز ہوا کو تابع بنادیا وہ ان کے حکم سے ان کو لے کر چلتی ہے، اس زمین کی طرف جس میں ہم نے برکت رکھی ہے، اور ان ساری چیزوں سے ہم بخوبی واقف ہیں، اور (ہم نے ان کے لیے تابع کردیا) ایسے شیطانوں کو جو ان کے لیے غوطہ لگاتے تھے اور ایسے عمل کرتے تھے جو ان کے لیے اس سے کم یا زیادہ کے تھے، اور ہم ہی ان کی حفاظت کرنے والے تھے)

ان آیات میں اللہ حضرت داؤد وحضرت سلیمان علیہما السلام کا ذکر کررہا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں کی الگ الگ خصوصیات رکھی ہیں، حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی ہونے کے ساتھ ساتھ مزید بادشاہت بھی دی تھی، صرف یہی نہیں بلکہ ان کو کاری گری کی صلاحیت بھی دی اور خاص سمجھ داری عطا فرمائی، مذکورہ آیات میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، اس سے خاص طور پر اس چیز کو سمجھا جاسکتا ہے۔

قضیہ دربار داؤد میں

ایک شخص حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اچانک شکایت لے کر پہنچا، اور اس طرح پہنچا کہ حضرت داؤد علیہ السلام گھبرا گئے کہ یہ کون ہے؟ کہیں یہ ہمیں مارنے تو نہیں آیا؟ چنانچہ جب انہوں نے پوچھا کہ تم کیسے آئے؟ اس نے جواب دیا: ہم اپنا ایک مسئلہ لائے ہیں، اس کو حل کیجیے، مسئلہ یہ ہے کہ ہماری کھیتیاں تھیں، اور ان کھیتیوں کو فلاں لوگوں کی بکریاں چر گئیں، اب ہماری ساری دولت ختم ہوگئی، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ اگر تمہارا اتنا نقصان ہوا ہے جتنا ان بکریوں کا فائدہ ہے تو ساری بکریاں تمہاری ہوں گی، یعنی اگر بکریاں ضائع شدہ کھیتی کی قیمت کے برابر پڑتی ہیں تو تم کو اس نقصان کے عوض بکریاں دی جائیں گی، اور اس طرح تمہارے نقصان کی تلافی کردی جائے گی، لیکن اس موقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام بھی موجود تھے، چنانچہ جب انہوں نے یہ فیصلہ سنا، تو انہوں نے اس میں ترمیم کردی، اور وہ فیصلہ اچھا

ثابت ہوا، قرآن مجید میں فیصلہ کی اسی ترمیم کے ساتھ واقعہ ذکر کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو کیسی سمجھ دی تھی۔

فیصلۂ سلیمانی

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: ایسا ہونا چاہیے کہ وہ بکریاں ان کھیت والے صاحب کو دے دی جائیں، جس کی کھیتی برباد ہوئی ہے، اور یہ اس کے دودھ سے وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور جتنا نقصان ہوا ہے جب وہ ادا ہوجائے تو بکریاں واپس کردے، یعنی کلی طور پر بکریاں اس کو نہ دی جائیں، بلکہ مستعار دی جائیں، تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے، اور جب نقصان کی تلافی ہوجائے تو وہ واپس کردی جائیں، اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ فیصلہ پسند فرمایا، اور قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا۔

ضروری وضاحت

حضرت داؤد علیہ السلام نے جس نوعیت کے ساتھ مسئلہ سلجھایا تھا، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ آدمی یوں ہی ان کے گھر میں بلا اجازت گھس آیا اور اپنے مسئلہ کو پیش کرنے لگا، اس پر انہوں نے اس کو گھر سے نہیں نکالا یہی کم بات ہے، ان کو اس بات کا حق تھا کہ وہ کہتے کہ عدالت میں آکر اپنا مسئلہ پیش کرنا، لیکن یہ ان کے ظرف کی بات تھی کہ انہوں نے ایسا اخلاق نہیں برتا۔

حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہ و حاکم بنایا تھا، ان کے پاس مختلف قسم کے مقدمات آتے تھے جن میں وہ فیصلہ دیتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی ذمہ داری کو پورے احساس کے ساتھ ادا کرتے تھے، ان آیات میں انبیاء کے واقعات کو پڑھ کر سمجھا جاسکتا ہے کہ نبیوں کو کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، اور کیسی کیسی صلاحیتوں کا ثبوت دینا پڑتا ہے، گویا اس میں ہر شخص کے لیے ایک پیغام ہے کہ تم نبی کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو، اللہ تعالیٰ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ فرشتہ بھیج

دیتا، اور وہ اپنی صلاحیت سے یہ سب کام کرلیتا، اس کے لیے اس میں محنت کی ضرورت نہ تھی، لیکن نبی انسان ہی ہوتا ہے، اس لیے اس کو اپنی عقل بھی استعمال کرنی پڑتی ہے، اپنی ذہانت بھی استعمال کرنی پڑتی ہے، اور لوگوں کے معاملات کو برداشت بھی کرنا پڑتا ہے، مشکلات کو جھیلنا پڑتا ہے، ناگوار حالات پر صبر کرنا پڑتا ہے، معلوم ہوا کہ نبی کے متعلق یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کو بہت آرام ملتا ہے، بلکہ اس کو بڑی پریشانی اور سمجھداری سے گذرنا پڑتا ہے۔

خدائی انعامات

حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کے واقعہ میں یہ بات بطور خاص ذکر کی گئی کہ جب وہ دونوں اس کھیتی کے سلسلہ میں فیصلہ دے رہے تھے، جس میں دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں، اس وقت ان کے فیصلہ کو "ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ لوگ کیا فیصلہ دیتے ہیں"، یعنی یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، ایسا نہیں تھا جیسا کہ آدمی کوئی واقعہ سن لیتا ہے، بلکہ یہ سب ہماری نگرانی میں ہورہا تھا، اور ہم دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ اس کو کس طرح ڈیل کرتے ہیں، تو ہم نے اس قضیہ کو سلیمان کو سمجھا دیا۔

یہاں ایک بات غور کرنے کی یہ بھی ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی ہی طرف نسبت کررہا ہے کہ حضرت سلیمان نے جو فیصلہ دیا یہ ہم نے ان کو صلاحیت دی اور ان کو سجھایا، اس کے بعد اپنی ہی طرف دونوں لوگوں کی نسبت کرتے ہوئے، فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ داؤد ان سے سمجھداری و فیصلہ میں کم تھے، بلکہ دونوں کو ہم نے سمجھداری بھی دی اور علم بھی دیا، یعنی ان میں سے کسی کے اندر نقص نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی بہت سمجھدار تھے، سوجھ بوجھ کے لوگ تھے اور واقف تھے، بس اپنے اپنے ذہن کے مطابق انہوں نے فیصلہ کیا، حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کا وہ حل مناسب سمجھا جس کو اوپر بیان کیا گیا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس سے زیادہ بہتر اللہ نے بات سجھادی، تو انہوں نے اس کا وہ حل پیش کیا، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو کچھ بھی کیا اس کی نسبت اللہ

تعالیٰ نے اپنی ہی طرف فرمائی اور صرف یہی بات نہیں بلکہ فرمایا کہ حضرت داؤد کو ہم نے اور صلاحیتیں بھی دی تھیں، یعنی صرف یہی فیصلہ کی کوئی ایک بات نہیں ہے، جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام آگے بڑھ گئے، بلکہ بتایا کہ حضرت داؤد کو ہم نے ایسا کر دیا کہ پہاڑ اور پرندے سب ان کے ساتھ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کائنات میں جو بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے، لیکن تم اس زبان کو نہیں سمجھتے، پہاڑ، پرندے سب اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، سب کی نمازوں وعبادات کی شکلیں ایسی ہیں کہ ان کو انسان نہیں سمجھ پاتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سب اللہ کی یاد میں ہے، چنانچہ فرمایا گیا کہ ہم نے داؤد کو ایسی سمجھ دی تھی کہ پہاڑ جو ذکر کرتے ہیں، اللہ کو یاد کرتے ہیں، تسبیح بیان کرتے ہیں، وہ اس کو سمجھتے تھے، اور ان کے ساتھ پہاڑ و پرندے سب ہی اللہ کی تسبیح بیان کرتے تھے۔

زرہ کی تعلیم

ان سب چیزوں کے کرنے اور کسی انسان کو ایسی صلاحیتوں سے نوازنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سب کچھ ہم ہی کرتے ہیں، اور ہمارے ہی کرنے سے ہو رہا ہے، یعنی ہم ہی نے حضرت داؤد علیہ السلام میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ وہ پہاڑوں کی تسبیح سمجھ رہے تھے اور سنتے تھے، اور پرندوں کی تسبیح بھی سنتے تھے، جب کہ انسان نہیں سمجھتا کہ یہ پرندہ کیسے اللہ کو یاد کرتا ہے، پہاڑ کس طرح اللہ کو یاد کرتا ہے، ہمیں تو بس بتایا گیا ہے اس لیے ہم مانتے ہیں، لیکن ہمیں کوئی تجربہ نہیں ہے، البتہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت دی تھی کہ وہ سمجھتے تھے، اس کے ساتھ مزید یہ بھی ہوا کہ ان میں زرہ بنانے کی صلاحیت بھی پیدا کر دی تھی، ان کے ہاتھ میں لوہا نرم ہو جاتا تھا، اور وہ اس کو اس طرح موڑ لیتے تھے، اس میں تصرف کرتے تھے جیسے آدمی کسی نرم چیز میں کرتا ہے، چنانچہ وہ لوہے کی ذرہیں بناتے تھے، جو ذرہ جنگ میں حملہ روکنے کے لیے پہنی جاتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ ہم نے اس

طریقہ سے انسانوں کو ذرہ کا سلسلہ عطا کیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کا ذریعہ بنایا کہ وہ لوہے کو آسانی سے موڑ کر ذرہ بناتے تھے، اسی لیے اس چیز کو اس صیغہ کے ساتھ بیان کیا گیا کہ ہم نے تمہارے لیے ان کو لباس کی صنعت سکھادی، تاکہ وہ ذرہ تمہاری حفاظت کرسکے، تمہارے آپس میں طاقت کا جو ٹکراؤ ہوتا ہے، تم جو تلوار و نیزہ چلاتے ہو، تو اب تم اس ذرہ سے میدان جنگ میں اپنے جسم کو محفوظ کرسکتے ہو۔

تخت سلیمانی

حضرت داؤد علیہ السلام کی خصوصیات کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خصوصیات کا بھی ذکر فرمایا گیا، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہوا کو تابع بنادیا تھا کہ ہوا ان کو اوران کے تخت کو لے کر اڑ کر بآسانی جہاں چاہیں پہنچادیتی تھی، یعنی ان کے اختیار میں یہ ہوتا تھا کہ وہ جدھر چاہیں جائیں، چنانچہ وہ اس سے اس زمین تک پہنچتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام شام میں تھے، اور یمن جاتے تھے، یعنی یمن اور شام کے درمیان ان کا یہ سفر ہوتا تھا، اور چند گھنٹہ میں وہاں پہنچ جاتے تھے۔

جنات پر حکمرانی

ہوا کو تابع بنادینے کے علاوہ بتایا کہ ان کو ایک چیز اور بھی دی تھی، وہ یہ کہ شیاطین اور جنوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کا تابع بنادیا تھا، شیطانوں پر وہ حکم چلاتے تھے، اور جو وہ حکم دیتے تھے، شیطان اس کام کو مجبور ہو کر کرتے تھے، ورنہ آپ پٹائی کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو پٹائی کرنے کی صلاحیت بھی دی تھی کہ اگر شیطان نہ مانے تو اس کی ایسی پٹائی کرتے کہ اس کی حالت خراب ہوجائے، اسی لیے سارے شیطان و جنات ان کے سامنے تابع تھے، لیکن یہ بھی فرمادیا کہ اصلاً اس نظام کو ہم ہی تھامے رہتے تھے، یعنی اصل ہم ہی ان کی حفاظت کرنے والے تھے، اور ان شیاطین و جنات کو تھامے رہتے تھے کہ وہ ان کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرسکتے تھے۔

www.abulhasanalinadw.org

حضرت ایوب علیہ السلام

﴿وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ☆ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِن ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَذِكْرَى لِلْعَابِدِينَ﴾

(الأنبياء: ٨٣-٨٤)

(اور ایوب نے جب اپنے رب سے دعا کی کہ اے پروردگار! میں بہت تکلیف میں مبتلا ہوں اور آپ کی ذات ارحم الراحمین ہے، تو ہم نے ان کی دعا قبول کرلی اور ان کو جو تکلیف تھی اس کو ہم نے کھول دیا اور ان کو ہم نے اہل وعیال عطا کیے اور ان کے جیسے اور عطا کیے، یہ ہماری طرف سے ان کے ساتھ رحم کا معاملہ ہوا اور یہ بات نیک لوگوں کے لیے یاددہانی کا باعث ہے)

حضرت ایوب علیہ السلام کے باغات اور جائداد تھی، وہ بہت ہی خوشحال تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ ان کا سب کچھ جل جلا گیا، ساری اولاد، سارے متعلقین کا انتقال ہوگیا، اور بالکل تنہا رہ گئے اور ہر چیز سے محروم ہوگئے، نیز ایسی بیماری ملی کہ اس میں ان کے لیے حرکت کرنا مشکل ہوگیا، بالکل بے سہارا ہوگئے، اس سے مقصود لوگوں کو یہ دکھانا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو بھی ایسے سخت حالات سے گذارنے پر قادر ہے، لہٰذا کسی کو یہ گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم بھی کچھ ہیں، بلکہ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہم

کچھ نہیں ہیں، کیونکہ جب نبی کو اللہ تعالیٰ اس طرح دکھا سکتا ہے، تو دوسرا شخص کیا حیثیت رکھتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مشکل حالات سے گذارا تو انہوں نے اللہ سے دعا کی، اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی دکھایا کہ لوگوں کی دعا کو بھی ہم ہی سنتے ہیں، بڑے سے بڑے مرض کو ہم ہی دور کر سکتے ہیں، بڑی سے بڑی مصیبت کو بھی ہم ہی دور کر سکتے ہیں، اسی طرح جب حضرت ایوب نے دعا کی تو اللہ نے ان کو بحال کر دیا، اور ان کے سارے زخم ختم ہو گئے، اور بیماری رخصت ہو گئی، پھر ایک دم سے اولاد ہونا بھی شروع ہو گئی اور پھر ان کی جائیداد بننا بھی شروع ہو گئی، پھر کچھ دنوں میں وہی خوشحالی واپس آ گئی اور وہ صاحب اولاد ہو گئے، اسی کے متعلق قرآن مجید کی ان آیات میں فرمایا گیا کہ انہوں نے اپنے پروردگار سے گڑگڑا کر دعا کی،:اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی، معلوم ہوا ان کو صحت یابی ان کی دعا سے حاصل نہیں ہوئی، بلکہ ہمارے قبول کرنے سے ہوئی، اور ان کو جو تکلیفات تھیں وہ ہمارے دور کرنے سے دور ہوئیں، اور پھر ہم ہی نے ان کو اہل وعیال عطا کیے، اور ان کے جیسے اور مزید بھی دیئے، گویا یہ سب کچھ ہماری طرف سے ان کے ساتھ رحم کا معاملہ ہوا، اور یہی نہیں بلکہ جو لوگ عبادت گذار ہیں، وفادار ہیں، نیک لوگ ہیں ان کے لیے یہ واقعہ یاددہانی کے طور پر ہے، یعنی جو نیک لوگ ہیں، جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس واقعہ سے ان کی یاددہانی ہو گئی کہ ان کا مزید اس بات پر یقین بڑھ گیا، ان کو پہلے سے بھی یہ یقین تھا کہ اللہ جو چاہے وہ کر سکتا ہے، اور سب اللہ کے سامنے تابع ہیں، کسی کا کوئی زور نہیں ہے، اور بڑے سے بڑے کو اللہ نیچے کر سکتا ہے اور نیچے کو اوپر کر سکتا ہے، پھر اس نے اپنے نبیوں کے ساتھ یہ کر کے بھی دکھایا، اور بتا دیا کہ ہم سے جو دل لگا کر گڑگڑا کر مانگتا ہے تو ہم اس کو دیتے ہیں، اسی لیے فرمایا کہ یہ واقعہ نیک لوگوں کے لیے یاددہانی کا باعث ہے، وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کتنی ہی عبادت کریں، لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے

بالکل بے بس ہیں، وہ جو چاہے گا وہی ہوگا، عبادت گذار ڈھیروں عبادت کر ڈالیں، اگر اللہ کو قبول ہے تو ٹھیک ہے، نہیں تو ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔

قدرت الٰہی کے مظاہر

حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دکھادیا کہ ان کو کیسے نیچے اتارا اور پھر جب انہوں نے اللہ سے مانگا تو ان کے مانگنے کو قبول کرلیا، گویا وہ خود کچھ نہیں کر سکتے تھے، ایسا نہیں تھا کہ وہ بیمار ہوگئے تھے تو علاج کر کے اچھے ہوجاتے، گرچہ اس وقت انہوں نے علاج کیا ہوگا لیکن علاج میں اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات نہیں دی، کیونکہ کوئی بھی دوا اس وقت تک کام نہیں کرے گی جب تک اللہ تعالیٰ کی اجازت نہیں ہوگی، لیکن بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہ نظام بنایا ہے کہ ذرائع کام کرتے ہیں، خاص طور سے اس دنیا کے اندر تو یہی نظام بنایا ہے، اسی لیے جب اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے خلاف بندوں کو کرتے دیکھتا ہے تو کچھ نہیں کہتا ہے، اس لیے کہ آخرت میں اس کی سزا ہوگی، بزرگوں کے یہاں اسی لیے یہ بات ہے کہ اگر دنیا میں سزا مل جائے تو بہت اچھا ہے، آخرت کی سزا سے بچ جائیں گے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ کو نقل کرنے کے بعد آخر میں فرمادیا کہ عبادت گذاروں کے لیے اس واقعہ میں یاددہانی ہے، اس سے ان کا یہ خیال تازہ ہوجائے گا کہ ہماری عبادت سے کچھ نہیں ہوگا، ہماری خواہش سے کچھ نہیں ہوگا، بلکہ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا تب ہوگا، لہٰذا ہر چیز اسی سے مانگو، اسی کے سامنے گڑگڑاؤ اور اسی سے امید کرو، تب کام بنے گا۔

تین صابر انبیاء

﴿وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ ☆ وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُم مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾
(الأنبياء: ۸۵-۸۶)

(اور اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل یہ سب صبر کرنے والے تھے، اور ہم نے ان کو اپنی رحمت کے دائرہ میں داخل کرلیا، بلاشبہ یہ اچھے لوگ تھے)

ان آیات میں تین نبیوں کا نام لیا، اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل، اور فرمایا کہ ان سب کا حال یہ رہا ہے کہ یہ سب صبر کرنے والے رہے ہیں، ان کو سخت حالات سے گذرنا پڑا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ وہ بالکل شیر خوار تھے اور ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی ماں کے ساتھ ایک بے آب و گیاہ جگہ پر چھوڑ آئے تھے، گویا اپنے نزدیک ان کو قربان کر کے چلے آئے تھے، چنانچہ اسی حالت میں ان کا نشو ونما ہوا، اب وہ کیسے زندہ رہے، انہوں نے کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کیں، اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے، پھر اس کے بعد یہ کہ ان کو ذبح کرنے کا حکم ہوا اور صرف یہی نہیں کہ ذبح کر دیتے، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ بذریعہ خواب ہم کو اس طرح کی ہدایت ملی ہے تو تمہارا کیا خیال ہے؟ اب اس سوال پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ظرف دیکھیں، انہوں نے جواب دیا کہ جب یہ حکم الٰہی ہے تو آپ فوراً ایسا ہی کریئے، ہم اس کے لیے بالکل تیار ہیں، غور کا مقام ہے کہ اس

www.abulhasanalinadw.org

سے بڑا کیا صبر ہوسکتا ہے؟!

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ حضرت ادریس علیہ السلام اور ذوالکفل علیہ السلام کے واقعات پرغور کرنے کی بھی دعوت دی گئی، کہا گیا کہ یہ سب صبر کرنے والے تھے، یعنی انہوں نے بڑے صبر کا ثبوت دیا تھا، البتہ یہاں ان کے حالات نہیں بیان کیے گئے، بس مختصرا یہ کہہ دیا گیا کہ یہ سب بڑے ہی صبر کرنے والے تھے، ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے، جس سے ان کے غیر معمولی صبر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ان کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے واقعات پرغور کریں تو ایسا کون ہوگا جوان کے برابر برداشت کیا ہو، یہ آخری درجہ کی بات ہے کہ وہ اپنی جان دینے کے لیے تیار ہوجائیں، غرض کہ ان سب لوگوں کے متعلق ان کے صبر کرنے کے نتیجہ میں صلہ کی بات کرتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ ہم نے ان کو اپنی رحمت کے اندر داخل کرلیا، یعنی ہم نے ان کے صبر کا بہتر صلہ دیا، کیونکہ یہ اچھے لوگ تھے، انہوں نے اطاعت وعبادت کا اچھا ثبوت دیا تھا۔

حضرت یونس علیہ السلام

﴿وَذَا النُّونِ إِذ ذَّهَبَ مُغَاضِباً فَظَنَّ أَن لَّن نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَن لَّا إِلَهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ☆فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذَلِكَ نُنجِي الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الأنبياء: ٨٧-٨٨)

(اور ذو النون (حضرت یونس علیہ السلام) کو دیکھو جب وہ کچھ ناراضگی لے کر چلے گئے اور یہ خیال کیا کہ شاید ہم ان پر قدرت نہیں رکھیں گے، پھر انہوں نے تاریکیوں کے اندر ہی دعا کی کہ اے پروردگار! کوئی معبود نہیں ہے آپ کے علاوہ، آپ کی ذات بڑی پاک ہے، بے شک میں خود ہی ظلم کرنے والا ہوں، تو ہم نے ان کی دعا قبول کر لی اور ان کو اس مصیبت سے ہم نے نجات دی اور اسی طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں)

ان آیات میں حضرت ذوالنون یعنی حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، حضرت یونس علیہ السلام بھی اللہ کے نبی تھے، وہ اپنی قوم کو دعوت دے رہے تھے، لیکن ان کی قوم ان کی بات نہیں مان رہی تھی، چنانچہ انہوں نے اخیر میں اپنی قوم سے کہا کہ تم پر اللہ کا عذاب آئے گا، اس بات کا ان کو بذریعہ وحی اشارہ ملا ہوگا کہ جلد ہی عذاب آجائے گا، مفسرین کا کہنا ہے کہ جب عذاب آنے میں دیر ہوئی، تو یہ پریشان

www.abulhasanalinadw.org

ہوئے، اور سوچا کہ لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے، اس لیے شرمندگی کی وجہ سے وہاں سے چلے گئے، لیکن جب گئے تو راستہ میں دریا پڑا، جس کو پار کرنا تھا، چنانچہ کشتی پر سوار ہوئے، کشتی چلانے والے ملاح لوگوں کو کشتی پر سوار کرکے دوسرے پار اتار دیتے تھے، لہٰذا یہ بھی اس پر پار ہونے کے لیے بیٹھ گئے، لیکن جب بیٹھ گئے تو ناؤ اتنی بھاری ہوگئی کہ لگتا تھا کہ ڈوب جائے گی، چنانچہ جب ناؤ والے پریشان ہوئے، تو اس وقت ان کا اس کے متعلق کچھ ایسا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے آقا کا نافرمان ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ناؤ کا برتاؤ اچھا نہیں ہوتا ہے، لہٰذا انہوں نے کہا کہ کیا ہم میں سے کوئی ایسا آدمی بھی ہے جو اپنے مالک کا نافرمان ہے؟ وہ اپنے آقا سے بھاگ رہا ہے؟ لیکن کسی نے جواب نہ دیا، چنانچہ جب قرعہ ڈالا گیا تو حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا، تو کہا گیا کہ ان کو یہیں سمندر میں اتار دو، اب بیچ سمندر میں ان کو ناؤ سے نکال کر ڈال دیا گیا، اور ایک مچھلی نے ان کو فوراً نگل لیا، پھر مچھلی کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہوا کہ تم ان کو نہیں کھا سکتیں، بلکہ تمہیں ان کی حفاظت کرنا ہے، گویا یہاں بھی اللہ تعالیٰ یہ بتا رہا ہے کہ اے لوگو! تم ہماری قدرت دیکھو کہ کس طرح ہم نے حضرت یونس کو مچھلی کے پیٹ میں محفوظ رکھنے کا نظم کیا، غرض کہ جب ان کو اس سخت مرحلہ سے گذرنا پڑا تو ان کو اپنی بات کا احساس ہوا، اور وہاں انہوں نے دعا کی کہ اے پررودگار! آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں، آپ کی ذات بڑی پاک ہے، اور میں خطا کار بندہ ہوں، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ دعا پسند آگئی، پھر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا اور مچھلی نے ان کو کنارہ لے جا کر اگل دیا، لیکن اس وقت وہ ایسی حالت میں تھے کہ اگر ان کو ایک مکھی بھی لگے تو تکلیف ہو، کیونکہ مچھلی کے اندر رہنے کی وجہ سے ان کا جسم ایسا ہوگیا تھا جیسے بالکل گل جاتا ہے، یعنی بہت نازک جسم ہوگیا تھا، چنانچہ غیبی نظم ہوا اور اللہ تعالیٰ نے وہاں پر ایک درخت پیدا کردیا جس نے ان کو اپنے سایہ میں لے لیا، بعض لوگوں نے اس علاقہ میں وہ درخت دیکھا ہے، بتایا جاتا ہے کہ وہ درخت یہاں نہیں ہوتا ہے، اس کی خصوصیات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے بڑے بڑے پتے ہوتے ہیں، انہیں نے حضرت یونس

علیہ السلام کے جسم کو ڈھانک لیا تھا تا کہ ان پر سایہ رہے اور دھوپ نہ لگے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی قوم

چند دنوں میں حضرت یونس علیہ السلام صحت یاب ہو گئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو واپس بستی میں جانے کی اجازت دے دی، جب وہ لوٹ کر آئے تو یہاں قوم کے ساتھ یہ معاملہ ہوا کہ وہ عذاب کے ڈر سے راہ راست پر آ گئی، تاریخ میں آتا ہے کہ تنہا ایک انہیں کی قوم ایسی ہے جو عذاب سے ڈر کر نیک بن گئی، دراصل ایسا ہوا کہ ان کی قوم کو آسمان پر عذاب نظر آیا، جس میں آگ کے شعلے بھی نظر آئے ہوں گے، یا جو کچھ بھی رہا ہو وہ ان کو نظر آیا، جس کے آثار دیکھتے ہی وہ لوگ ڈر گئے، اور سب لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر جنگل میں چلے گئے، وہاں انہوں نے رونا شروع کر دیا، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا شروع کی، تو اللہ تعالیٰ نے عذاب واپس کر دیا اور اس قوم کو معاف کر دیا۔

غرض کہ جب حضرت یونس علیہ السلام بستی میں واپس آئے تو دیکھا کہ قوم سے عذاب واپس ہو گیا اور پوری قوم نیک بن گئی ہے، لہٰذا پھر وہ اپنی قوم میں رہے، غرض کہ حضرت یونس علیہ السلام کے اس واقعہ میں تمام لوگوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کے واقعہ سے عبرت حاصل کرو، وہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، مگر ان کو کس مرحلہ سے گذرنا پڑا، ان کو اپنی بستی سے ہٹنا نہیں چاہیے تھا، لیکن وہ ہٹ گئے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی گرفت فرمالی، معلوم ہوا کہ بڑے کی معمولی غلطی بھی پکڑ میں آتی ہے، ان کے لیے مناسب یہ تھا کہ چاہے کچھ ہو جاتا لیکن وہاں سے نہ ہٹتے، گویا وہاں سے ہٹنے کا ان کو اتنا سب کچھ بھگتنا پڑا، لیکن جب انہوں نے رو دھو کر دعا مانگی، تو پھر اللہ تعالیٰ یہ بھی دکھاتا ہے کہ ہم نے ان کی دعا قبول بھی کر لی، گویا وہ یہ بتا رہا ہے کہ سب کچھ ہم ہی کرتے ہیں، تم کس دھوکہ میں ہو، اور سزا بھی ہم ہی دیتے ہیں، معاف بھی ہم ہی کرتے ہیں، ہم ہی اٹھاتے بھی ہیں اور گراتے بھی ہیں، بظاہر تمہیں یہ نظر آتا ہے کہ تم کرتے ہو، یا یہ ذرائع و وسائل کرتے ہیں؟ ایسا نہیں ہے، یہ نہیں کرتے، تم اس دھوکہ میں نہ رہو کہ وسیلہ کچھ

ہوتا ہے، وسیلہ اور ذریعہ صرف ایک بہانہ ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ وسائل کے ذریعہ سے کرتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ سب کچھ کرتا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ بغیر ذرائع ووسائل کے بھی کرے۔

لمحہ فکریہ

خلاصہ یہ کہ ان تمام واقعات میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، فرمایا کہ جب یونس کچھ ناراضی لے کر چلے گئے، تو شاید انہوں نے یہ خیال کیا کہ ہم ان پر قدرت نہیں رکھتے، کیا ان کو یہ خیال نہیں ہوا کہ ہم اس پر ان کی پکڑ کر سکتے ہیں، کیا وہ بھول گئے تھے کہ ہم ان پر قدرت رکھتے ہیں، لیکن بہرحال جب وہ چلے گئے اور مچھلی نے ان کو نگل لیا تو وہاں پر بھی ہم ہی نے ان کی حفاظت کا بندوبست کیا، اور جب انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں آواز لگائی اور کہا کہ پرودگار آپ ہی سب کچھ ہیں، آپ کی ذات بڑی پاک ہے، بے شک میں ہوں ہی ظلم کرنے والا، تو فرمایا گیا کہ ہم نے ان کی دعا قبول کر لی، ان آیات میں یہ پہلو بہت غور طلب ہے کہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف نسبت فرما رہا ہے، یعنی یہ بتا رہا ہے کہ محض دعا مانگنا کافی نہ تھا، بلکہ ہمارا قبول کرنا اصل تھا اور ہم نے قبول کرلیا، ہمیں ان کا وہ طرز اچھا لگ گیا، ان کا مانگنا پسند آ گیا، اس لیے ہم ہی نے ان کو اس مصیبت سے نجات دی، اور ہمارا طریقہ یہی ہے کہ ہم ایمان والوں کو اسی طرح نجات دیتے ہیں۔

www.abulhasanalinadw.org

حضرت زکریا علیہ السلام

﴿وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَى رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْداً وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ☆ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَى وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَباً وَرَهَباً وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ﴾ (الأنبياء: ۸۹-۹۰)

(اور زکریا کو دیکھو جب انہوں نے اپنے رب کو آواز لگائی کہ اے میرے پروردگار! ہم کو تنہا نہ چھوڑ اور سب سے بہتر وارث تو آپ ہی ہیں، تو ہم نے ان کی دعا قبول کر لی اور ان کو یحیی عطا کیے اور ان کی بیوی کو ٹھیک کر دیا، واقعی یہ لوگ خیر کے کاموں میں بہت تیزی دکھاتے تھے، اور ہم سے دعا کرتے تھے رغبت وخوف کی کیفیت کے ساتھ اور ہم سے بہت ڈرتے تھے)

یہ حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ ہے، حضرت زکریا علیہ السلام کی کوئی اولاد نہیں تھی، وہ کافی بوڑھے ہوگئے تھے اور ان کی بیوی بھی بوڑھی ہوگئی تھیں، گویا وہ عمر کے ایسے مرحلہ میں تھے کہ اولاد کا سوال ہی نہیں تھا، حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے نبی تھے، اور اس قوم کا حال نہایت برا تھا، چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ احساس ہوا کہ اس قوم کے حالات اچھے نہیں ہیں، ابھی ہم دین اور لوگوں کی اصلاح کے لیے کچھ محنت وکوشش کر رہے ہیں، لیکن جب ہم اس دنیا سے چلے جائیں گے، تو پھر ان کا کیا ہوگا، نہ

www.abulhasanalinadw.org

جانے یہ قوم کیا کرے گی، ایسا کوئی نظر نہیں آتا جو ان کی اصلاح کی فکر کرے، چنانچہ انہوں نے آواز لگائی کہ اے پروردگار! آپ ہم کو تنہا نہ چھوڑیئے، اور ہم کو کوئی وارث عطا فرما دیجئے، البتہ سب سے بہتر وارث تو آپ ہی ہیں، بعد میں آنے والے کو وارث کہتے ہیں، یعنی یہ صحیح ہے کہ آپ ہمیشہ رہیں گے اور آپ سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن اس دنیا میں ہم کو تنہا نہ چھوڑیئے کہ ہمارا سلسلہ ہی ختم ہو جائے، حضرت زکریا علیہ السلام نے کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی، اور ان کو یحیٰ جیسا بیٹا عطا کیا جن کا دوسری جگہ ذکر آتا ہے کہ ان کو اللہ نے بہت خوبیاں دی تھیں، حضرت یحیٰ جیسے بیٹے سے نوازنے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیوی کو بھی ٹھیک کر دیا، کیونکہ پہلے وہ بچہ دینے کے حال میں نہیں تھیں، تو ان کو اس حال میں کر دیا کہ وہ اس لائق بن سکیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام پر ان انعامات کی بارش کا سبب بتاتے ہوئے فرمایا کہ ایسا ہم نے یوں کیا کہ یہ لوگ خیر کے کاموں میں بہت تیزی دکھاتے تھے، اور ہم کو پکارتے رہتے تھے، ہم سے دعا کرتے رہتے تھے رغبت وخوف کے ساتھ، یعنی امید بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے، یہاں دعا کے اندر دونوں چیزیں بتائی گئی ہیں؛ اللہ سے امید قائم کرنا اور ساتھ ساتھ ڈرنا بھی، یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے، وہ ہم کو سزا بھی دے سکتا ہے، اور ہماری دعا کو رد بھی کر سکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ امید بھی رکھنا کہ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم وکریم ہے، وہ ہم کو عطا بھی کر سکتا ہے۔

www.abulhasanalinadw.org

حضرت مریم علیہا السلام

﴿وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (الأنبياء: ۹۱)

(اور وہ خاتون جس نے اپنی شرمگاہ کو بہت محفوظ رکھا تو اللہ نے اپنی روح سے ان میں اثر ڈال دیا اور ان کو اور ان کے بیٹے کو ہم نے سارے عالموں کے لیے ایک نشانی بنا دیا)

اس آیت میں حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ ہے، بتایا گیا ہے کہ یہ وہ خاتون تھیں جنہوں نے اپنی شرمگاہ کو بہت محفوظ رکھا، اس زمانہ میں عبادت خانوں کے لیے وقف ہونے کا رواج تھا، چنانچہ ان کو بھی عبادت خانہ کے لیے وقف کر دیا گیا تھا، تو خاتون ہونے کے ساتھ عبادت خانہ کی ذمہ داری نبھانا یقیناً بہت مشکل کام تھا، نہ جانے ان کو کتنے خطرات پیش آتے تھے، گویا ایک طرف جوانی اور دوسری طرف مختلف خطرات سے اپنے کو محفوظ رکھنا بہت بڑی بات تھی، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ بات پسند آئی، اسی لیے فرمایا کہ ہم نے ان کے اندر اپنی طرف سے یہ بات کر دی کہ جو مرد کے ذریعہ سے ہوتا ہے، وہ محض اللہ کے حکم سے ان کے ساتھ ہو جائے، چنانچہ ان کے بیٹا تولد ہوا اور اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے بیٹے کو ساری دنیا کے لیے نشانی بنا دیا، یعنی حضرت عیسیٰ و مریم علیہا السلام کا واقعہ ایک علامت بن گیا کہ اللہ کیا کیا کر سکتا ہے اور اس کی قدرت کا دائرہ کتنا وسیع تر ہے۔

www.abulhasanalinadw.org

متحدہ امت

﴿إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ☆وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ﴾ (الأنبياء: ۹۲-۹۳)

(بے شک یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا تنہا رب ہوں لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو، لیکن لوگوں نے خود کو اپنے آپ ٹکڑوں میں بانٹ لیا ہے، ہر ایک کو ہمارے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے)

انبیاء کے واقعات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ جن کا ذکر ہوا یہ سب ایک ہی امت کے لوگ ہیں، یہ الگ الگ نہیں ہیں، گرچہ یہ سب الگ الگ زمانہ اور الگ الگ قوموں میں تھے، لیکن درحقیقت یہ سب ایک ہی خاندان ہے، اور یہ سب امت ایک ہی امت ہے، البتہ تم سب کے مالک تنہا ہم ہی ہیں، لہٰذا تم سب میرے بندے بنو اور میری ہی عبادت کرو۔

اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کے بعد لوگوں کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے کو ٹکڑوں میں بانٹ لیا ہے، ہر ایک نے اپنا الگ الگ حساب بنالیا ہے، حالانکہ ہم نے ان سب کو ایک ہی خاندان بنایا ہے، سارے نبی ایک خاندان ہیں، سارے ایمان والے ایک خاندان ہیں، خواہ وہ کسی زمانہ میں ہوں، دراصل وہ ایک ہی سلسلہ کی لڑی ہیں، لیکن افسوس لوگوں پر ہے کہ انہوں نے اپنے کو ٹکڑوں میں بانٹ لیا۔

اخیر میں یہ بھی وضاحت کردی گئی کہ ایسا نہیں ہے کہ تم نے جو تقسیم کرلی وہ درست ہے اور معاملہ یہیں پر ختم ہوگیا، بلکہ تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ہمارے پاس تم کو لے کر آنا ہے، اور ہمارے سامنے حساب دینا ہے کہ تم نے یہ کیوں کیا، جب کہ ہم نے تم کو کسی اور چیز کے کرنے کو کہا تھا، اور تم کو کوئی دوسری ذمہ داری دی تھی۔

اس سے قبل انبیاء کا ذکر چل رہا تھا، اور وہاں یہ بات بتائی گئی تھی کہ وہ مختلف

حالات سے گذرتے ہیں، اور وہ اپنے ان حالات کے لحاظ سے مختلف معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ سب ایک ہی لڑی میں سموئے ہوئے ہیں، سب ایک ہی امت ہیں، ان کو الگ الگ نہ سمجھو، تم لوگوں نے ان کو الگ الگ کر دیا ہے، یعنی جس نبی کے ماننے والے لوگ ہیں بس اسی نبی تک اپنے کو محدود کر لیا ہے، حالانکہ سارے نبی ایک ہی سلسلہ کے ہیں، اور اپنے اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے انہوں نے نبوت کا کام انجام دیا ہے، اس لیے کہ انسانی حالات متنوع ہیں، اور زمانہ کے ساتھ ساتھ، وقت کے ساتھ ساتھ ان حالات میں تبدیلی بھی ہوتی ہے، اور تقاضے بھی نئے نئے سامنے آتے ہیں۔

فرق کا معیار

انسانی معاشرہ میں خاص طور پر جو چیز نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ کہ ایک شخص بہت تنگی و ترشی کی حالت میں ہے، اس کو دو وقت کا کھانا مشکل ہے، لیکن اس نے محنت کی اور محنت کر کے اس نے معاش کا انتظام کر لیا، اور اس نے ایسا کاروبار کیا، ایسی کوشش کی کہ وہ پھر خوش حال ہو گیا، لیکن چونکہ اس نے یہ خوشحالی اپنی محنت سے حاصل کی تھی، اس لیے اس میں بے توازنی نہیں تھی، وہ بہت احتیاط سے خرچ کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر کرتا ہے اور اسراف نہیں کرتا، اس لیے کہ اس نے مال کو محنت سے حاصل کیا ہے، تو اس کو وہ اس طرح خرچ نہیں کر سکتا جو آدمی بے محنت کرتا ہے، لیکن جب اس کی اولاد آئی تو خوش حالی کی حالت میں آئی، اور اس نے دیکھا کہ پیسے کی ریل پیل ہے، اور اس کو بے دریغ خرچ کرنے کو مل رہا ہے، حالانکہ باپ نے اپنی زندگی میں رعایت کی، باپ نے سنبھال کر خرچ کیا، لیکن بیٹے کی محبت میں وہ اپنے اصول پر نہیں چل پاتا، چنانچہ بیٹا خوشحالی کی حالت میں نشو ونما پایا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ جو محنت کی عادت اس باپ کو تھی، اور جس کوشش و سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے کی عادت اس کو تھی، وہ اس کے بیٹے میں نہیں ہو سکتی، بیٹا یہی چاہے گا کہ آرام کے ساتھ اس کو سب کچھ ملے، کیونکہ وہ

www.abulhasanalinadw.org

محنت کرنے کا عادی نہیں ہوگا، گویا یہاں سے اب ان دونوں کا طرز زندگی الگ ہوجائے گا، اب جب بھی ان سے کسی شخص کو کوئی معاملہ کرنا ہوگا، تو وہ یکساں معاملہ نہیں کرسکتا، جب باپ کے ساتھ معاملہ پڑے گا، تو باپ کے مزاج کو دیکھنا پڑے گا، اوراس کے حالات کو دیکھنا پڑے گا، اوراسی لحاظ سے اس سے معاملہ کرنا ہوگا، اور جب بیٹے سے معاملہ کرے گا تو اس لحاظ سے کرے گا، اگر دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرے گا تو معاملہ خراب ہوجائے گا۔

تاریخ انسانی میں بارہا انسان مختلف اطوار وحالات سے گذرا ہے، ایک ہی زمانہ میں سوسائٹیوں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، غربت والی سوسائٹی ہے، اسی کے بغل میں دوسری بہت خوشحال سوسائٹی ہے، جس کے پاس زندگی کے بڑے وسائل ہیں، لہٰذا جب شریعت کا حکم آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں سب کے مزاجوں کو جانتا ہے، اوران کے حالات کو بھی جانتا ہے، اس لیے وہ احکام بھی اسی حساب سے بھیجتا ہے، تربیت کے نظام میں بھی یہی ہوتا ہے کہ آپ جس کی تربیت کررہے ہیں، اس کے مزاج وحالات کو دیکھ کراس کی تربیت کی جائے گی، یعنی ہرایک کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں ہوگا۔

غرض کہ نبیوں کے حالات میں جوفرق ہے وہ فرق نبوت کا نہیں ہے، بلکہ جن لوگوں میں ان کو کام کرنا ہے، ان کے لحاظ سے فرق ہے، اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے، لیکن جب بنی اسرائیل نے نبیوں کو قتل کرنا شروع کردیا، ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ کردیا، ان کو چلنا مشکل کردیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کو تنگ کیا، حتی کہ انہوں نے شکوہ کیا کہ ہم کو کیوں پریشان کرتے ہو، تب جاکر اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسندیدگی ہوئی، اورایک عرصہ تک انبیاء کا سلسلہ موقوف رہا۔

ہرنبی اپنی قوم کا قائد ہوتا ہے، پہلے اوراس زمانہ میں ایک فرق یہ ہے کہ پہلے دینی احساس وشعور عام تھا، دین سے لوگ وابستہ ہوتے تھے، خواہ کوئی بھی دین ہو، لیکن اس زمانہ میں یہ لحاظ چھایا ہوا ہے کہ دین سے لوگوں کا بہت کم تعلق ہے اوردنیا سے زیادہ ہے،

www.abulhasanalinadw.org

یعنی عام طور پر الحاد ہے، اور لوگو کا یہ تصور بن گیا ہے کہ دین وآخرت کچھ نہیں ہے، صرف آدمی مرکر چلا جائے گا، اور کام ختم ہوجائے گا، پہلے یہ ہوتا تھا کہ جو دینی لوگ ہوتے تھے وہ قائد بھی ہوتے تھے، قوم عام طور پر انہیں کی رہبری میں چلتی تھی جو اس قوم کے دینی سربراہ ہوتے تھے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام ان میں آکر نئی دعوت پیش کرتے تھے، واضح رہے کہ نئی دعوت اس قوم کے لحاظ سے پیش کرتے تھے، اور پھر وہ قوم اس کی مخالفت کرتی تھی، اس لیے کہ لوگوں کا ایک مزاج تھا کہ ہم جس دین پر قائم ہیں اس کو ہم کیسے چھوڑ دیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے حالات بیان کرکے یہ فرمایا کہ ان کے ساتھ لوگوں نے ہمیشہ برا سلوک کیا، البتہ جب برا سلوک کیا ہے تو ان کا انجام بھی برا ہوا۔

دعوت فکر و عمل

گذشتہ آیات میں متعدد انبیاء علیہم السلام کے واقعات الگ الگ بیان فرمائے گئے اور ان کی کیفیات بیان فرمائی گئیں، جن سے ایک بنیادی بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ انسان انسان ہے، اللہ تعالیٰ نبی بھیجتا ہے، تو انسانوں ہی میں سے انتخاب کر کے بھیجتا ہے، لیکن چونکہ سارا نظام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے، اور وہی چلا بھی رہا ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس کا صرف بنایا ہوا ہے، بلکہ وہی اس نظام کو چلا بھی رہا ہے، جیسے کہ گذشتہ صفحات میں پنکھے کی مثال گذری کہ اس کو کسی نے بنایا، اور آپ اس کو چلاتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ جس نظام پر اس کے بنانے والے نے پنکھے کو متعین کر دیا، وہ اسی کے حساب سے کام کرے گا، گویا وہ اپنے اس نظام کا پابند رہے گا، جس کو اس کے بنانے والے نے متعین کیا ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ بنانے والا اپنے کام سے فارغ ہو جاتا ہے اور وہ آپ کے اختیار میں آجاتا ہے، اب آپ اس کو چلا رہے ہیں، وہ پنکھا آپ کا تابع ہے، لیکن پہلے وہ پنکھا اس بنانے والے کا تابع ہے، اگر اس نے اس میں اس کے صحیح حصے رکھے ہیں، اس کے پرزے صحیح لگائے ہیں، تو وہ پنکھا چلنے کے قابل بنے گا، اس میں چلنے کی صلاحیت پیدا ہوگی، اور اگر پرزے صحیح نہیں لگائے تو وہ چلنے کے قابل نہیں ہوگا، چاہے چلانے والا کتنا ہی قابل ہو، لیکن پنکھا نہیں چلے گا، اس لیے کہ اس میں نقص ہے، پھر اب وہ جس کو دے دیا گیا ہے وہ اس کو چلا رہا ہے، اور وہ پنکھا اس کے ماتحت ہے، جب وہ چلائے گا تب چلے گا، اس کو خود اپنا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کو جس نے جس نظام پر بنا دیا ہے، اس کے بنائے ہوئے اصول

کے مطابق ہی وہ چلے گا، لیکن کسی کے چلانے ہی سے چلے گا، خود سے نہیں چل سکتا۔

نظام کائنات کی مثال

یہ دنیا بھی ایک نظام کے مطابق ہی چل رہی ہے، اور یہ نظام اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، اور یہ بات کہی ہے کہ اسی نے اس نظام کو بنایا ہے اور وہی چلا بھی رہا ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ کارخانہ میں کاریگر نے پنکھا بنا دیا، اگر اس نے وہ پنکھا صحیح بنایا ہے تو چلے گا ورنہ نہیں چلے گا، گویا جس شخص نے پنکھا بنایا ہے، پنکھا اس کا تابع ہوا، لہٰذا وہ جیسا بنائے گا وہ ویسا کام کرے گا، خود اس کو یعنی پنکھے کو کوئی اختیار نہیں ہے، پھر بنا کر وہ پنکھا جس کے سپرد کر دیا گیا ہے وہ اس کے قابو میں ہے، یعنی یہاں دو لوگوں کے ماتحت نظام چل رہا ہے، ایک اس کے جس نے بنایا ہے، اور ایک اس کے جس کے پاس وہ ہے، لیکن نظام کائنات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ ہی دونوں چیزوں کا کرنے والا ہے، اسی نے سارا نظام بنایا ہے اور وہی چلا بھی رہا ہے، یہ سارا نظام اللہ تعالیٰ ہی کے ماتحت ہے، چلانے میں بھی اور بننے میں بھی، اللہ نے جیسا نظام بنا دیا ہے ویسا نظام ہو گیا ہے، پھر اللہ نے جس طرح اس کو چاہا ہے ویسا چلایا ہے۔

انسان اور دیگر مخلوقات میں فرق

غور کا مقام ہے کہ جس خدا نے اتنی بڑی کائنات بنائی ہو، جس کو آج تک کوئی مکمل طور پر نہ دیکھ سکا ہو، وہ خود کتنا بڑا ہوگا، یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم اس کو اس طرح دیکھ ہی نہیں سکتے جس طرح چیزوں کو دیکھتے ہیں، کیونکہ یہ بالکل عقل میں آنے والی بات ہے کہ جس نے اتنی بڑی کائنات بنائی ہو، ظاہر ہے وہ خود اس سے بہت بڑا ہوگا، یہ فطری بات ہے کہ آدمی جو چیز بنا رہا ہے وہ خود اس سے بڑا ہوگا، چونکہ کائنات کی ہر ہر چیز کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے، اسی کا ارادہ ہے، اور ساری مخلوقات اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، اس لیے یہ نتیجہ خود بخود نکلتا ہے کہ اسی کی ذات لائق عبادت اور بڑی ہے، ہر چیز اسی کے تابع ہے، جس طرح پنکھا بنانے والے اور جس

کے تصرف میں ہے اس کی اجازت کے بغیر کام نہیں کرسکتا، اور وہ جیسا بنادیا گیا ہے، اس رفتار سے آگے نہیں بڑھ سکتا، ٹھیک اسی طرح کائنات کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے تابع ہیں، ان کو جیسا اللہ تعالیٰ نے بنادیا ہے، وہ ویسا ہی کام کرسکتی ہیں، پھر یہ کام کرنا ان کے لیے اسی وقت ممکن ہے جب اللہ تعالیٰ یہ چاہے کہ ان سے کام لے، یعنی جب اللہ تعالیٰ ان سے کام کرائے گا تو وہ کریں گی، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں میں ایک خصوصیت یہ بھی رکھی ہے کہ ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں، یعنی اللہ کی شکر گزار ہیں، ان کے اندر اللہ تعالیٰ کو بڑا ماننا، اپنا موجد وخالق ماننا، یہ ساری چیزیں موجود ہیں، لیکن انسانوں میں اللہ تعالیٰ نے جو کیفیات رکھی ہیں وہ اس کو محسوس ہوتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بنایا ہے، وہی ہم کو چلا رہا ہے، جتنی نعمتیں ہم کو حاصل ہوئی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہیں، ہماری زندگی بھی اللہ کی دی ہوئی ہے، زندگی کی مدت بھی اسی کی مقرر کردہ ہے، اس کے قائم رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ بھی اللہ نے ہم کو دی ہیں، لہٰذا ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے، کیونکہ انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں وہ سب بے اختیار ہیں اور شکر گزار ہیں، گویا شکر گزاری ان کے مزاج میں ہے، قرآن مجید میں آتا ہے کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے، ساری چیزیں اس کو یاد کرتی ہیں، لیکن ان کی زبان تمہیں نہیں معلوم ہے کہ کس طرح یاد کرتی ہیں، اس لیے تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ چیزیں بس ایسی ہی ہیں، حالانکہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتی ہیں، لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کو یاد کرے اور چاہے تو نہ کرے، تسبیح پڑھے یا نہ پڑھے، اور یہ اختیار امتحان کے لیے دیا ہے، اصلاً اس کو بغیر خدا کی مرضی کے اختیار نہیں ہے، بلکہ اس کی مرضی سے اختیار حاصل ہے، تاکہ یہ دیکھا جائے کہ اختیار ملنے پر انسان اپنے خالق ومالک کا شکر گزار ہوتا ہے یا نہیں، بے اختیاری میں تو ظاہر ہے کہ انکار کر ہی نہیں سکتا، مثلاً: آپ کسی لکڑی کو توڑ دیں تو وہ آپ کے اختیار میں ہے، وہ ٹوٹنے سے انکار نہیں کرے گی، تو جب ان کو اتنا اختیار نہیں، لہٰذا وہ مکلّف ہی نہیں ہیں بلکہ مسیّر ہیں، یعنی چلائی جاتی

www.abulhasanalinadw.org

ہیں، لیکن انسان و جنات کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے، تاکہ اس کو آزمایا جا سکے۔

دخول جنت کی شرط

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خاص طریقہ سے پیدا فرمایا، لیکن جب ان سے غلطی ہوگئی، تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ چونکہ یہ مٹی سے بنائے گئے ہیں اور مٹی کی خصوصیات پست و حقیر بھی ہیں، اس لیے ان سے یہ غلطی ہوئی، چنانچہ انہوں نے اپنی غلطی پر معافی مانگ لی، اور اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، لیکن اس کے بعد یہ طے ہے کہ اب حضرت آدم علیہ السلام کا یہ سلسلہ قیامت تک چلے گا، لوگ پیدا ہوتے رہیں گے، سب کا امتحان ہوگا، اور اب انسان جنت میں معافی مانگ کر ہی لوٹے گا، جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے مانگی تھی، اللہ تعالیٰ نے جنت کو سجایا ہے تاکہ وہ لوگ جو اللہ کی تسبیح بیان کریں گے، جو اختیار ملنے پر اللہ کے وفادار ہوں گے، ان کو اللہ تعالیٰ جنت میں بھیجے، لیکن جو اختیار سے غلط فائدہ اٹھائیں گے، اس کی نعمتوں کا انکار کریں گے، اس کی بڑائی کا انکار کریں گے تو اللہ کے یہاں ان کی کوئی جگہ نہیں ہے، ان کے لیے یہ ہے کہ وہ جہنم میں جائیں، لیکن جہنم سے بچانے کا اللہ تعالیٰ نے اس طرح انتظام کیا ہے کہ اس نے دنیا میں بھٹکے ہوئے لوگوں کو نصیحت کرنے والے بھیجے، اور ایسے لوگ یعنی انبیاء علیہم السلام بھیجے کہ جو بہتر سے بہتر انسانی صفات ہو سکتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے وہ صفات ان میں رکھیں۔

سبب و مسبب کی تشریح

اللہ تعالیٰ اس نظام کو سبب و مسبب کے ذریعہ سے چلا رہا ہے، ہر چیز ذرائع سے اللہ تعالیٰ کر رہا ہے، جب کہ وہ بغیر ذرائع سے بھی کر سکتا ہے، لیکن اسی کا یہ نظام ہے کہ وہ ذرائع سے کرتا ہے، اس کے یہاں ایک "خلق" (پیدا کرنا) ہے اور دوسرے "امر" (حکم دینا) ہے، امر یعنی کسی کو حکم دیا تو وہ چیز ہوگئی، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب اختیار ہے وہ جو چاہے بنا دے، اور ایک خلق ہے یعنی تدبیروں سے چیز وجود میں آتی ہے، اس کو مختلف شکلوں میں دیکھا جا سکتا ہے، مثلاً: انسان کیسے بنتا ہے، باپ کے اندر سے نکل کر ماں

www.abulhasanalinadw.org

کے نطفہ میں جاتا ہے، وہاں آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، اور پھر دنیا دیکھتا ہے، اسی طرح ایک درخت ابتداء میں بیج ہوتا ہے، اور ایک پورا نظام مکمل ہو کر وہ درخت بنتا ہے۔

اگر آپ اس نظام پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ انبیاء علیہم السلام کا معاملہ بھی یہی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ایسے حالات سے گذارتا ہے، خاندان سے لے کر آخر تک کہ ان میں وہ ساری خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جو انسان کی بہتر سے بہتر خوبیاں ہو سکتی ہیں، یعنی عزم ہے، ہمت ہے، مقابلہ ہے، جرأت ہے، خیر پسندی ہے، اور برائیوں سے اجتناب ہے، یہ سب چیزیں ان میں پائی جاتی ہیں، ان کی طبیعت ایسی ہو جاتی ہے کہ بری چیز کو برا سمجھتی ہے، اور یوں تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان ہی کی ایسی طبیعت بنائی ہے کہ وہ برے کو برا اور اچھے کو اچھا سمجھتا ہے، لیکن اس کے باوجود گناہوں میں مبتلا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی خواہش ولذت کی خاطر اس کے خلاف کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وعلم سے نوازا، جن کی بنیاد پر انسان کو معلومات حاصل ہوتی ہیں، اور وہ اپنا راستہ اختیار کرتا ہے، عقل کے ذریعہ بہتر راستہ اختیار کرتا ہے، اور معلومات سے صرف راستہ معلوم کرتا ہے، اس بڑے انعام کے ساتھ انسانیت پر خدا کا خاص فضل یہ ہوا کہ اس نے نبیوں کا سلسلہ قائم کر دیا، جب انسان بہت بگڑ گیا، اور بہت خرابیوں میں مبتلا ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے سمجھانے کے لیے نبی بھیجے، تا کہ انسان کو قیامت کے روز یہ کہنے کا حق نہ رہے کہ ہمیں معلوم نہیں تھا، ہمیں کسی نے بتایا نہیں تھا، معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات منصف ہے، اور وہ اپنے بندوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے گا، ایسا نہیں ہے کہ وہ بے سبب کسی کو سزا دے دے، بلکہ سب کچھ انصاف کے ساتھ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں رحمت بھی ہے، لہٰذا جو رعایت اور گنجائش انصاف کے ساتھ ہوگی، اللہ وہ رعایت کرے گا، لیکن ایسا نہیں ہوگا کہ ایک شخص کو گناہوں پر سزا دی جا رہی ہے، اور دوسرے کو گناہ پر سزا نہ دی جائے، کیونکہ یہ انصاف نہیں ہوا، بلکہ دوسرا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کو کیوں مستثنیٰ کر دیا گیا، اس لیے سب کے ساتھ یکساں معاملہ ہوگا، سوائے اس کے کہ کوئی وجہ ایسی ہو جس کو اللہ بنیاد

www.abulhasanalinadw.org

بنا کرکسی آدمی کو رعایت دے دے، جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات آدمی کی ایک بات اللہ تعالیٰ کو پسند آ گئی، اس کی بنیاد پر اللہ نے رعایت دے دی۔

خدا کا انصاف

تاریخ میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ کسی شخص نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی، اب یہاں کوئی شخص اس دھوکہ میں نہ رہے کہ کسی بھی کتے کو پانی پلانا مغفرت کی ضمانت کا اعلان ہے، بلکہ اس صورت حال کا معلوم ہونا بھی نہایت ضروری ہے جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اس کے عمل کو پسند فرمایا اور اس کی مغفرت فرمائی۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ شخص ایسی جگہ تھا جہاں دور دور تک پانی نہ تھا، سخت پانی کی دشواری تھی، وہاں صرف ایک کنواں تھا، لیکن وہاں سے وہ کیسے پانی لے، چونکہ وہ خود بہت پیاسا تھا، اس لیے کنوئیں کے اندر اترا اور وہاں جا کر بڑی مشکل سے پانی پیا، یہاں یہ بھی غور کی بات ہے کہ محفوظ طریقہ سے گہرے کنوئیں میں کیسے اترا ہوگا؟ غرض کہ جب فارغ ہو کر کنوئیں سے باہر آیا تو دیکھا کہ وہاں ایک کتا بھی پیاسا ہے، چنانچہ اس کو اس پر رحم کا جذبہ آیا، اور وہ پھر کنوئیں میں اترا اور اس نے اپنے موزے میں پانی بھرا، اور منھ سے پکڑ کر موزے کو کسی طرح چڑھ کر باہر آیا، بس اللہ کو اس کی یہ ادا ایسی پسند آ گئی کہ اس کے لیے جنت طے فرمادی، اور اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے۔

معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا ہے، یہاں اس بات کی دلیل موجود تھی کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رعایت کر دے گا، اس لیے اس کو معاف کر دیا گیا، لیکن ایسا نہیں ہے کہ آدمی یوں ہی گناہ کرتا رہے اور کہے کہ ہمارا رب ہم کو معاف کر دے گا، جیسا کہ یہود کے بارے میں آتا ہے، وہ کہتے تھے کہ ارے ہمیں معاف کر دیا جائے گا، خواہ ہم کچھ بھی کریں، کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے ہیں۔

انبیاء کی زندگی انسانیت کے لیے نمونہ

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا حال بیان کیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ

اس بات کی تصحیح بھی کردی ہے کہ نبی کا مطلب یہ نہ سمجھو کہ وہ فرشتے کی طرح ہیں، وہ فرشتے نہیں بلکہ ایک انسان ہیں، اسی لیے ایک انسان ہونے کی وجہ سے جو انسانی باتیں ہوتی ہیں وہ ان میں بھی ہوں گی، لیکن وہ اپنی اس بے نفسی کی وجہ سے ان باتوں پر قابو پالیتے ہیں جو ان کو غلط راستے پر لے جاسکتی ہیں، ایسا نہیں ہے کہ نبی کو کوئی چیز اچھی نہیں لگتی، اور وہ بالکل ہر چیز سے مستغنی ہے، بس صرف عبادت کررہا ہے، بلکہ اس کو بھی نبی ہونے کے باوجود دنیا میں انسانوں کی طرح رہنا ہوتا ہے، انسانوں جیسے مسائل پیش آتے ہیں، مشکلات پیش آتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ یہ دکھایا کہ وہ نبی ہیں لیکن ایسے سخت بیمار پڑے کہ بالکل مایوسی ہوگئی، اور ان کا سب کچھ تباہ ہوگیا، البتہ جب انہوں نے دعا کی تو اللہ کو ان کی دعا پسند آگئی، اور اللہ نے اپنے غیب سے ان کے لیے سامان کردیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی دکھایا کہ حضرت یونس علیہ السلام ایک نبی ہیں، لیکن ایک بات ان کو محسوس ہوگئی، جس کی وجہ سے وہ اپنی بستی سے چلے گئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی بنایا تھا، اور نبی بنانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ جب تک خدا کی مرضی ہے تب تک وہیں رہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ہونے کے باوجود ان کی بھی گرفت فرمالی، مگر جب انہوں نے دل سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ کو ان کی دعا پسند آگئی اور اللہ نے ان کو نجات دی، گویا اللہ تعالیٰ ان واقعات کے ذریعہ یہ دکھا رہا ہے کہ یہ سب ہمارے اختیار میں ہے، سب کچھ ہم ہی کرتے ہیں، نبی کے ساتھ بھی معاملہ ہم ہی کرتے ہیں، نہ نبی کرتا ہے نہ کوئی دسرا کرتا ہے، کوئی کچھ نہیں کرسکتا ہے جب تک کہ ہم نہ چاہیں، جب ہم چاہیں گے تبھی ہوگا، دوسری طرف اسی مالک حقیقی نے یہ بھی دکھایا کہ حضرت سلیمان وداؤد علیہما السلام کو وہ چیزیں عطا فرمادیں، جو دوسرے کے بس میں نہیں ہیں، غرض کہ جو کچھ بھی کیا وہ اللہ تعالیٰ ہی نے کیا، اور اس سب کے پیچھے اسباب بھی رکھے جن کی بنا پر کیا، یعنی یہ بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ کسی کو بڑھا دیا اور کسی کو گھٹا دیا، بلکہ انسان ہونے کے ناطے ان کو بھی انسانی حالات سے گزرنا پڑے گا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے کیسے سخت حالات سے گذرنا پڑا، آپ اللہ کے محبوب تھے، اگر وہ چاہتا تو ذرا بھی

تکلیف نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ آپ کے لیے ایسے اسباب پیدا کرسکتا تھا کہ آپ کے سامنے دولت کے انبار ہوتے، لیکن انسان ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ان سب چیزوں سے گزارا، اور پھر ان چیزوں کا فائدہ یہ ہوا کہ ان سے ان کی نبوت کی صلاحیت میں اضافہ بھی ہوگیا، ان میں جرأت پیدا ہوئی، ہمت پیدا ہوئی، صبر کی صلاحیت پیدا ہوئی، قرآن مجید کی مختلف سورتوں کا مطالعہ کیا جائے، بالخصوص سورۂ "والضحی" میں دیکھیں کہ حضور ﷺ کو کیا اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہوگا؟ یقیناً آپ ﷺ بحیثیت انسان جب سوچتے ہوں گے کہ ہم خالص اللہ کے دین میں اپنے کو کھپا رہے ہیں، تو ہم کو بھی کچھ سہولتیں مل جائیں، بظاہر مایوسی نظر آرہی ہے کہ لوگ پریشان کررہے ہیں، ذلیل کررہے ہیں، اور آپ کو اللہ کے کام کے لیے سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، چنانچہ آپ کو یہ احساس ہوسکتا ہے کہ اللہ کے یہاں سے مدد ہوجاتی تو یہ سب تماشہ بند ہوجاتا، اسی احساس کی ترجمانی کرتے ہوئے سورۂ ضحیٰ میں فرمایا گیا:

﴿وَالضُّحَى ☆ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَى ☆ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَى ☆ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَى﴾ (الضحی: ۱-۴)

(چڑھتے ہوئے دن کی روشنی کی قسم، اور رات کی قسم جب وہ تاریک ہوجائے، آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا، اور بعد میں آنے والے حالات آپ کے لیے پہلے والے حالات سے زیادہ بہتر ہیں)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے، آپ یہ ہرگز نہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی طرف متوجہ نہیں ہے، وہ آپ کی رعایت نہیں کررہا ہے، بلکہ اس سب سے مقصود مختلف حالات سے گذارنا ہے، تمام انبیاء کے ساتھ یہی معاملہ رہا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿حَتَّى إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ (یوسف: ۱۱۰)

(یہاں تک کہ جب رسول مایوس ہونے لگے اور (مشرکین نے)

سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا بس (اسی وقت) ہماری مدد آ پہنچی)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد یوں ہی نہیں آ جاتی ہے، بلکہ پہلے اللہ پوری طرح حالات سے گذار دیتا ہے جب اس کی مدد آتی ہے، آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات اتنے خراب ہوئے ہیں کہ اللہ کے رسول مایوس ہونے لگے، انہیں یہ خیال ہوا کہ اب اس میں کچھ نہیں ہوگا، اب ناکامی ہی ناکامی ہے، فرمایا گیا کہ تب جاکر ہماری مدد آئی، یعنی پہلے ہم پوری طرح جانچ لیتے ہیں، تب مدد دیتے ہیں، یہ نہیں ہے کہ آدمی دو رکعت نماز پڑھ کر سمجھے کہ غزوۂ بدر والی مدد ہم کو فوراً ملے گی، جیسا کہ آج کل مسلمان سمجھتے ہیں، لوگوں کا یہ خیال بن گیا ہے کہ ہم مسلمان ہیں اس لیے وہ مدد ہمیں ملنی چاہیے جو غزوۂ بدر میں ملی تھی، حالانکہ غور کرنا چاہیے کہ اس وقت مدد کیسے ملی تھی اور کن مراحل سے گذارنے کے بعد ملی تھی، یہاں تک کہ حضور ﷺ کو اپنی دعاؤں میں یہ کہنا پڑا کہ اے پروردگار! اگر تیرے یہ بندے اس جنگ میں ہار گئے تو پھر آئندہ اسلام باقی نہیں رہے گا، یہی چند آدمی ہیں جو ایمان کو لے کر کھڑے ہیں، اگر یہ ختم ہو گئے تو ایمان نہیں رہ سکے گا، معلوم ہوا اس وقت یہ حالات تھے، تب خدا کی مدد آئی تھی۔

غرض کہ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ سب کچھ ہمارے اختیار میں ہے، لہٰذا کسی کو گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے، تم یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم نبی کی بھی باز پرس کر لیتے ہیں، اس کے مقابلہ میں عام آدمی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا، حضور ﷺ کے ساتھ بھی یہ معاملہ پیش آیا کہ غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے لوگوں کو فدیہ دے کر چھوڑا، اس پر سخت الفاظ وارد ہوئے، لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا اور فدیہ کو قبول کر لیا، اس سے صاف طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، لیکن بے انصافی نہیں فرمائی ہے، وہ صاف صاف کہتا ہے کہ ہم بے انصافی نہیں کرتے ہیں، لیکن جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ ہم ہی کرتے ہیں، کوئی اس دھوکہ میں نہ رہے کہ ہم بذات خود کرتے ہیں، یہ حقیقت سمجھ لو کہ اگر ہم نہ چاہیں تو تم کچھ بھی نہیں کر سکتے، چاہے تم نبی ہو یا ولی یا پھر کوئی عام انسان، گویا اس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے عقیدہ

کو درست کیا ہے، اس سلسلہ میں بسا اوقات بہت غلطی ہوجاتی ہے، آدمی بزرگوں اور علماء کو یہ سمجھتا ہے کہ بس یہ جو چاہیں گے کر دیں گے، حالانکہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اسی کی یاددہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے واقعات کو بیان کیا، تاکہ لوگوں کا ذہن درست رہے۔

محنت کا صلہ

﴿فَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ☆وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ☆حَتَّى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ☆وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ☆إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ☆لَوْ كَانَ هَؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ☆لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ☆إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَى أُوْلَئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ☆ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ☆لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (الأنبياء: ۹۴-۱۰۳)

(تو جو بھی نیک کام کرے گا اور وہ مؤمن ہوگا تو اس کی کوشش کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا اور بے شک ہم سب کچھ لکھ رہے ہیں، اور یہ بات طے ہوگئی کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا ہے اب وہ واپس نہیں آسکتے، یہاں تک کہ یاجوج و ماجوج نہ نکلیں اور وہ ہر جگہ سے نکل نکل کر آئیں گے، اور حق وعدہ سامنے آجائے گا (اس وقت یہ حال ہوگا کہ) جنہوں

www.abulhasanalinadw.org

نے کفر کیا ہے ان کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی، (وہ کہیں گے) ہائے ہماری بدقسمتی، ہم اس بات سے بالکل غفلت میں رہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم غلط کام ہی کرتے رہے، (خدا کا فیصلہ ہوگا کہ) تم اور جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے یہ سب جہنم کا کوڑا کرکٹ بن جائیں گے اور تم سب وہاں پہنچ کر رہو گے، اگر واقعی یہ تمہارے خدا ہوتے تو یہ جہنم میں نہ جاتے اور اب ان سب کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے، وہاں ان کی چیخیں ہوں گی اور وہاں ان میں سننے کی صلاحیت ہی نہ ہوگی، بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے اچھائی پہلے ہی سے طے کر دی گئی ہے وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے، وہ لوگ جہنم کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور وہ ان چیزوں میں ہمیشہ ہمیش مزے لیتے رہیں گے جو ان کی پسند کی ہوں گی، ان کو کسی بھی قسم کی گھبراہٹ سے سابقہ ہی نہیں پڑے گا بلکہ فرشتے ان سے ملاقات کر کے کہہ رہے ہوں گے، یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا)

ان آیات میں بتایا گیا کہ جو شخص بھی حالت ایمان میں کوئی نیک کام کرے گا یعنی اس کا عقیدہ درست ہوگا اور وہ صحیح دین پر قائم ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا، بلکہ وہ ان نیکیوں کو قبول کرے گا، ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ہم بندوں کے سب حالات لکھ رہے ہیں، لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قلم سے لکھا جا رہا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک ایک چیز کو ہم ریکارڈ کر رہے ہیں۔

مستحق عذاب قومیں

جن قوموں پر ان کی بداعمالیوں کے سبب اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا، ان کے متعلق فرمایا گیا کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا ہے اور اس پر عذاب بھیجا ہے، اب وہ بستی دوبارہ نہیں بسے گی، بلکہ جن کو ہم نے ختم کر دیا وہ ختم ہو گئے، اب وہ واپس نہیں

www.abulhasanalinadw.org

آسکتے، اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ آبادی و بربادی کا یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب تک کہ یاجوج ماجوج ہر جگہ سے نہ نکلیں گے، ہر کونہ اور ہر نشیب سے نکل کر نہ آئیں گے، یعنی وہ بڑی تعداد میں آئیں گے، اور پوری دنیا میں ایک شور مچادیں گے، ہنگامہ کردیں گے، ساری دنیا کو پریشان کردیں گے، اور فرمایا کہ جب یہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حقیقی وعدہ ہے کہ قیامت آئے گی، وہ برپا ہوگا، یعنی قیامت میں سب کا حساب ہوگا، اور اس وقت کفار کا یہ حال ہوگا کہ سب اپنی بے بسی کو محسوس کررہے ہوں گے، سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، آنکھیں ایسی گڑی رہ جائیں گی کہ آنکھوں کو حرکت دینا مشکل ہوگا، جیسے آدمی جب کوئی خطرناک چیز دیکھتا ہے تو اس پر پوری نگاہ اٹک جاتی ہے، وہ اس کو دیکھ کر خوف زدہ ہوجاتا ہے، تو یہی حالت اس وقت ہوگی جب قیامت کا زلزلہ آئے گا اور سب کی نگاہیں خیرہ ہوجائیں گی، اس وقت لوگ کہیں گے کہ ہائے ہماری بدقسمتی، ہم بہت غفلت میں تھے، کاش اس وقت مان لیا ہوتا، اس وقت ان سب کو افسوس ہوگا کہ ہائے ہم نے اپنے آپ کو تباہ کرلیا، ہم اس بات سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم غلط کام کرتے رہے، اور ہم اپنے ساتھ زیادتی کرتے رہے، اپنے کو نقصان پہنچاتے رہے، اب آج ہم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ میں آرہا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرماتے ہوئے کہے گا کہ تم اور تمہارے جو معبود ہیں جن کو تم نے اپنا معبود بنارکھا تھا، کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب تمہاری مدد کریں گے؟ اب دیکھو یہ سب ایک ساتھ جہنم کا کوڑا کرکٹ بنیں گے، اور تم سب بھی وہاں یعنی جہنم میں پہنچو گے، اب رعایت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، اب تم کچھ نہیں کرسکتے، ہم نے تم کو کرنے کا جو موقع دیا تھا وہ تم نے گنوادیا، اب تو تم کو سب کچھ بھگتنا ہوگا۔

جہنم میں جاتے وقت ان کے ذہن کو اپیل کرنے والی ایک بات یہ بھی کہی جائے گی کہ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ تمہارے جو یہ معبود ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو، اگر یہ واقعی خدا ہوتے، جیسا کہ تم نے سمجھا تھا، تو یہ جہنم میں نہ جاتے، یعنی ان کی کچھ بھی

صلاحیت ہوتی تو جہنم میں نہ جاتے، جن کو تم دنیا میں یہ سمجھتے تھے کہ ان سے تمہارا کام چلے گا، اب آج دیکھو ان کا کیا حال ہے، ان سب کو ہمیشہ جہنم میں رہنا ہوگا، اور جہنم کی خطرناکی ایسی ہے کہ وہاں صرف ان کی چیخیں ہوں گی، یہ تکلیف سے چیخیں گے، اور ان میں سے کسی کو سننے کی بھی صلاحیت نہیں ہوگی۔

متقین کا استقبال

اسی کے ساتھ نیک لوگوں کا انجام کار بتاتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ ایسے ہیں جن کے لیے اللہ نے پہلے سے ہی اچھائی طے فرمادی ہے، یعنی جن کو اللہ نے پہلے ہی سے راہ حق پر چلا دیا ہے، تو وہ لوگ جو جہنم سے دور رکھے جائیں گے، وہ جہنم کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے، وہاں کی آگ کی جو لپٹیں اور کراہیں اور اس میں جو آوازیں ہیں، وہ بھی نیک لوگوں کو سننا نہیں پڑیں گی، یعنی وہ جہنم سے اتنے دور کر دیئے جائیں گے کہ وہاں کی آوازیں بھی نہیں سنیں گے، بلکہ وہ ان چیزوں میں مگن ہوں گے جو ان کی پسند کی ہیں، انہیں میں وہ مزے لے رہے ہوں گے اور ہمیشہ مزے لیتے رہیں گے، وہاں ان کو اللہ تعالیٰ جو نعمتیں دیں گے وہ ان میں مست رہیں گے، اور ان کو کبھی بھی غم سے سابقہ نہیں پڑے گا، جب کہ اس وقت دوسری طرف بہت گھبرا دینے اور خوف پیدا کرنے والی صورت حال ہوگی، برے لوگوں کے لیے جہنم کا ہنگامہ اور اس کی مصیبت ہوگی، لیکن اس سے ان کو کوئی رنج نہ ہوگا، اس لیے کہ ان کا اس سے سابقہ ہی نہیں پڑے گا، بلکہ ان کا حال تو یہ ہوگا کہ فرشتے ان سے آکر ملیں گے اور کہیں گے کہ مبارک ہو یہ وہ دن ہے جس کا تم سے نبیوں کے ذریعہ وعدہ کیا جارہا تھا، یعنی جنت کا تم سے جو وعدہ کیا جارہا تھا، آج وہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے حق میں پورا فرمادیا۔

متقین پر خدا کے انعامات

مذکورہ آیات میں برے لوگوں کا انجام کار بتانے کے بعد اس کے بالکل بالمقابل بات بیان کی اور بتایا کہ جنھوں نے دنیا میں اچھا رویہ اختیار کیا، اور نبیوں کی

بات مانی، یعنی جو لوگ نیک ہیں اور پہلے سے ہی ان میں خوبی اللہ کی طرف سے طے ہوگئی ہے، تو وہ عذاب اور جہنم سے بالکل دور رکھے جائیں گے، ان کے دل کو بھی اللہ خوش کرے گا، یعنی ہوتا یہ ہے کہ مصیبت کو دیکھ کر آدمی پر اثر پڑتا ہے، اور خوف کی ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ دہشت رہتی ہے کہ کہیں ہمیں یہ خطرہ لاحق نہ ہو جائے، اسی کے متعلق اشارہ فرمایا کہ وہ اس تکلیف سے بالکل دور رکھے جائیں گے، ان کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ لوگوں کو کس طرح سزا ہو رہی ہے، وہ کس طرح مارے جا رہے ہیں، معلوم ہوا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اتنے عزیز ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا دل بھی نہیں دکھانا چاہتا، اسی لیے فرمایا کہ وہ لوگ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے، یعنی جہنم میں جو کچھ ہو رہا ہے، جس طرح لوگوں کو سزائیں ہو رہی ہیں، وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے، اللہ ان کو اس سے بھی الگ رکھے گا، گویا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا سلوک بہت انعام کا ہوگا، یہ انعام ہی کی بات ہے کہ جو بھی ان کی خواہشیں ہوں گی وہ اللہ تعالیٰ ان کو عطا فرمائے گا، اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، ایسا نہیں ہے کہ ان کی خواہش وقتی طور پر پوری ہوگئی، بعد میں پوری نہیں ہوگی، جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے کہ اگر آپ کو کوئی نعمت حاصل ہوئی تو اس کا ایک وقت ہوتا ہے اور وقت گذر جانے کے بعد دو چار دن یا مہینہ دو مہینہ اور اس کے بعد پھر پریشانیاں شروع ہو جاتی ہیں، بلکہ وہاں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنی خواہش والی زندگی میں ہمیشہ رہیں گے، وہاں ان کی خواہش چلے گی، اور وہاں جہنم میں جو زبردست خوف کا منظر ہے، اور خوف کی جو صورت حال ہے، وہ صورت حال ان کو غمگین بھی نہیں کرے گی، یہ بھی انسانی فطرت میں داخل ہے کہ جب آدمی مصیبت کو دیکھتا ہے تو ڈرتا ہے یا رنجیدہ ہوتا ہے، ڈرتا اس بات سے ہے کہ کہیں یہ مصیبت ہم پر نہ آجائے، یا یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ مارے جا رہے ہیں، ان کو سزا ہو رہی ہے، یہ دیکھ کر ترس کھانے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور رنج ہوتا ہے کہ ہم ان کو بچا نہیں سکتے، بس ہم دیکھ رہے ہیں، اسی لیے فرمایا گیا کہ وہاں جو سخت خوف کی صورت حال ہوگی وہ بھی ان کو رنجیدہ نہیں کرے گی، یعنی ان کو افسوس و غم کرنے اور رنج کرنے سے بھی اللہ محفوظ رکھے گا، بلکہ ان پر مزید یہ انعام ہوگا کہ فرشتے آ آ کر ان کو خوشی کا پیغام دیں گے،

فرشتے آئیں گے، ان سے ملیں گے، اوران سے کہیں گے کہ تم دیکھو یہ ہے وہ دن جو تم سے وعدہ کیا جارہا تھا کہ تمہیں جنت ملیں گی، اور وہاں تمہیں حوریں ملیں گی، ہر طرح کے مزے ملیں گے، دیکھو یہ دن آ گیا، لہٰذا تم یہ نہ سمجھو کہ یہ اتفاقی طور پر ہورہا ہے، بلکہ تم واقعی جنت میں آ گئے ہو، اور تمہیں یہ چیز حاصل ہوگئی ہے، اب مسلسل تمہیں یہ چیزیں ملیں گی، اوران کا انقطاع نہیں ہوگا، جیسا کہ دنیا کا حال ہے کہ آدمی کو کسی چیز سے فائدہ ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ اتنی ہی دیر کا ہے، ہوسکتا ہے ہم سے یہ واپس لے لیا جائے، اس لیے کہ دنیا کی زندگی کی یہی عادت پڑی ہوتی ہے، اس میں انسان یہی دیکھتا رہا ہے کہ کوئی چیز مستقل نہیں ہوتی، حالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی اچھے حالات ہوتے ہیں، کبھی برے ہوتے ہیں، وقتی طور پر آدمی کو فائدہ ہوتا ہے، بعد میں اس کو نقصان ہوتا ہے، اسی لیے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ یہ چیز قائم رہے گی یا نہیں، البتہ آخرت کا معاملہ اس سے الگ ہے، اس کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ دن جس کو تمہیں بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے روز تم کو یہ چیزیں ملیں گی، یہ وہی دن ہے، لہٰذا اب یہ نہ سمجھنا کہ یہ دن اور یہ نعمتیں عارضی ہیں، بلکہ یہ وہی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کا اس طرح تذکرہ کردیا کہ جو لوگ نافرمان ہیں ان کو کیسی سزائیں ہوں گی، اسی کے ساتھ جو فرماں بردار ہیں ان کو کیسا خوش کیا جائے گا۔

نظام کائنات اور خدا کا برحق وعدہ

﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْداً عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ﴾ (الأنبياء: ١٠٤)

(جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح کاغذ کتاب لپیٹ دی جاتی ہے، جس طرح ہم نے اس کائنات کو شروع کیا تھا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ لے آئیں گے، یہ ہمارا وعدہ ہے، بے شک ہم ہی کرنے والے ہیں)

قرآن وحدیث میں نظام کائنات کے متعلق جو کچھ بتایا گیا ہے، موجودہ سائنس

www.abulhasanalinadw.org

بھی اس کی تائید میں کھڑی نظر آتی ہے، قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں یہ نظام کائنات سمٹا ہوا تھا، اس وقت جو بھی اس کی شکل تھی، دھوئیں کی شکل رہی ہو یا کوئی اور شکل ہو، لیکن یہ نظام کائنات سمٹا ہوا تھا، اس کے بعد اب یہ پھیلتا چلا جارہا ہے، اور وسیع ہوتا چلا جارہا ہے، اور اس کے جو کرے ہیں، وہ ایک دوسرے سے دور ہورہے ہیں، فاصلے بڑھتے چلے جارہے ہیں، جیسے کوئی چیز کھلتی یا پھیلتی چلی جارہی ہو، اسی طرح یہ کائنات اتنی پھیل چکی ہے کہ اس کے سرے کو آدمی دوربین سے بھی نہیں دیکھ سکتا، اس کے غیر معمولی فاصلے ہیں۔

ایک نظام شمسی ہے، یعنی سورج کا نظام، سورج اور اس کے اردگرد جو سیارے ہیں، ان میں زمین بھی ایک سیارہ ہے، سورج دراصل ایک ستارہ کہلاتا ہے، اور اس کے اردگرد جو کرے گھوم رہے ہیں، وہ سیارے کہلاتے ہیں، یہاں نو سیارے ہیں جو اس سورج کے اردگرد چکر لگا رہے ہیں، ان میں ایک زمین بھی ہے، جو سورج کا پورا چکر ایک سال میں لگاتی ہے، اور روزانہ اپنے گرد ایک چکر لگاتی ہے، گویا سورج کا ایک عالم ہے جو نظام شمسی کہلاتا ہے، اس میں سارے سیارے ایک خاندان ہیں، جن کا سب سے بڑا ممبر سورج ہے، جس کی روشنی سارے سیاروں میں جارہی ہے، اس روشنی کی رفتار ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ تراسی ہزار میل ہے، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سیاروں کی جو دوری ہے، یہ بھی روشنی کے حساب ناپی جاتی ہے، اس لیے کہ وہاں کوئی دوسرا پیمانہ کام نہیں کرتا، اسی لیے ستاروں اور سیاروں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اتنے نوری سال کے فاصلے پر ہے، ایک نوری سال کا مطلب یہ ہے کہ ایک سال کے اندر روشنی جتنا فاصلہ طے کرتی ہے، اتنے فاصلہ پر ہیں، اس کا دنیوی پیمانوں کے اعتبار سے آپ کوئی حساب نہیں لگا سکتے، غرض کہ اس کائنات میں کروروں سورج ہیں اور ہر کہکشاں میں ہیں، ان کے مجموعوں کو کہکشاں کہتے ہیں، کہکشاں میں بھی کروروں سورج ہیں، تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنی بڑی کائنات ہوگی، ایک عالم شمسی ہی کو لے لیا جائے تو اس جیسے کروروں عالم ہیں، اور وہ کروروں ایک کہکشاں میں ہیں، اور

www.abulhasanalinadw.org

کہکشاں بھی کروروں ہیں، تو یہ اندازہ لگانا ہی انسانی صلاحیت سے بالاتر بات ہے کہ کائنات کتنی بڑی ہے، خلاصہ یہ کہ ان سب کے متعلق اندازہ یہ ہے کہ یہ سب پہلے قریب قریب تھے، لیکن اب بحکم الٰہی یہ سب برابر دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔

بنی اسرائیل کی گستاخیاں

مذکورہ آیت میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ایک دن ہم آسمان کو سمیٹ دیں گے، لپیٹ دیں گے، یعنی جب قیامت آئے گی تو یہ پورا نظام شمسی ختم ہوجائے گا، اور وہ اللہ کی ناراضگی کا نتیجہ ہوگا، جیسا کہ جب بنی اسرائیل نے اپنے انبیاء کو قتل کیا اور ان کو ناراض کیا، اور آخری حد اس وقت ہوئی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انہوں نے برا سلوک کیا، تب اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی سب حرکتوں کو دیکھ رہا تھا، اس کی نگاہ میں ہر ایک کے کرتوت تھے، قوم عاد نے کیا کیا، قوم ثمود و عدی نے کیا کیا، وہ سب اس کے علم میں تھا، غرض کہ ان کی نافرمانیاں اس حد تک بڑھیں کہ اللہ کو ان پر عذاب بھیجنا پڑا، آخر میں وہ لوگ جو بہت ہی محترم تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے نوازا تھا، ان کو بہت اعلیٰ مقام دیا تھا، وہ بھی آہستہ آہستہ اتنی برائیوں تک پہنچ گئے کہ انبیاء تک کو قتل کرنے لگے، چنانچہ خدا تعالیٰ سخت ناراض ہوا اور طے کیا کہ اب نبیوں کا سلسلہ موقوف کردیا جائے، کیونکہ وہ نبی کیوں بھیجے، جب وہ لوگ قتل ہی کردیتے ہیں، اور نبی کی ایسی نافرمانی کرتے ہیں کہ بے چارے کو زندہ نہیں رہنے دیتے، لیکن ظاہر بات ہے کہ جب نبیوں کا سلسلہ رک جائے گا تو پھر ان لوگوں کی کیا بری حالت ہوگی، اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں ہے، جب نبی بھیجنے پر ان کا یہ حال ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ آخری حد تک نافرمانی میں پہنچ جاتے ہیں، اور جب کوئی سمجھانے والا نبی ہی نہ ہوگا تو یہ کتنے گر جائیں گے، یہ تو گندے جانوروں سے بھی بدتر ہوجائیں گے، غرض کہ اللہ تعالیٰ کو ناراضگی ہوئی، اور انسانوں کی اس سوسائٹی سے اللہ تعالیٰ کو ایک نفرت ہوئی، خواہ وہ عرب ہوں یا عجم، ان

کی حالت کیا تھی، بس ایسا لگتا تھا کہ یہ کوئی کیڑے مکوڑے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ مستقل نبی بھیجتا رہا، وہ نبی ان کو سمجھاتے رہے تا کہ یہ جنت جاسکیں، لیکن ان کا یہ حال ہے کہ یہ نافرمانی پر تلے ہوئے ہیں، اور بہت پھوہڑ پن کے ساتھ نافرمانی کررہے ہیں، جب کہ ہم ہی نے ان کو ساری نعمتیں دی ہیں، ان کو بہت اعزاز عطا کیا ہے، اور اس کے بعد ان کی یہ حالت ہے کہ یہ گندگی کے اندر گھسے ہی چلے جارہے ہیں، اور اس حد تک گھس گئے ہیں کہ جو بھی ان کو سمجھائے اسی کو ماررہے ہیں۔

خدائی مار

انسانی سوسائٹی کی اسی متعفن صورت حال کے سبب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کا سلسلہ موقوف کردیا، لیکن وہ ارحم الراحمین ہے، اور بندوں میں ہمیشہ اس کے کچھ بندے نیک رہے ہیں، چنانچہ ان پر اللہ تعالیٰ کو رحم آیا، اور چھ سو سال کا وقفہ ایسا گذرنے کے بعد جس میں کوئی نبی نہ آیا، آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خاتم النبیین بنا کر بھیجا، جس زمانہ میں کوئی نبی نہ آیا، اس مدت میں انسانوں کی حالت مزید گرتی چلی گئی، لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کو بھیجا، اور ان کو ایسا بنایا کہ بعد میں کسی نبی کی ضرورت باقی نہ رہے، یعنی ان کی نبوت ہی اب آخر تک کام دے جائے، اسی لیے آپ کو خاتم الرسل بنایا، اور نبوت کا کام آپ کی امت کو سپرد کردیا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، لیکن نبی کا کام جاری رہے گا، اور امت وہ کام کرے گی۔

انسانی طبیعت کی کمزوری

انسان کی طبیعت میں یکسوئی نہیں ہے، اس سے اس بات کا بہت زیادہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ خرابی میں بڑھتا چلا جائے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ آخر میں اس دنیا کی یہ حالت ہوگی کہ یہاں اللہ کا نام لینے والا کوئی نہیں رہ جائے گا، اسی لیے آتا ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جب اللہ کا نام لینے والا کوئی نہ رہ جائے گا، یہ قیامت کیا چیز ہوگی، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مظہر ہوگی، اس کا حکم ہوگا کہ ان بدمعاشوں کو توڑ دو،

www.abulhasanalinadw.org

ماردو، ختم کردو، کیونکہ قیامت اسی وقت آئے گی جب اللہ کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہ جائے گا، اس وقت اللہ تعالیٰ کو غصہ آئے گا اور یہ سارا نظام ختم ہوجائے گا، زمین پھٹ جائے گی، اندر کا سارا لاوا باہر آجائے گا، اور آسمان اور پہاڑ اس طرح بے وزن ہوجائیں گے، جیسے گرد ہوں، اس وقت پھر انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اور بتایا جائے گا کہ دیکھو کہ تم کیا کر کے آئے ہو، اب اس کو سمجھو، جس سے تمہیں ڈرایا جارہا تھا اب وہ تمہارے سامنے ہے، مذکورہ آیت میں اسی منظر کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے، جیسے کہ کاغذ اور کتاب لپیٹی جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جس طرح ہم نے اس کائنات کو شروع کیا تھا، ہم اس کو دوبارہ پیدا کریں گے، اور ایک نیا نظام ہوگا، دنیا والا نظام ختم ہوجائے گا، پھر زمین بھی نئی بنے گی اور سب چیزوں کی نئی شکل آجائے گی، اور یہ سب کوئی اٹکل بات نہیں ہے، بلکہ بتایا گیا کہ یہ ہمارا وعدہ ہے، ہم ایسا ضرور کریں گے، قیامت آئے گی، اور جس وقت آئے گی، تو اپنے اسی ہیبت ناک طریقہ سے آئے گی، جس کا انسان کو تصور بھی مشکل ہے۔

طے شدہ بات

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُون ☆إِنَّ فِي هَذَا لَبَلَاغاً لِّقَوْمٍ عَابِدِين﴾

(الأنبياء: ١٠٥-١٠٦)

(اور ہم نے زبور میں یہ بات لکھ دی ہے (دین کی باتوں کے) تذکرہ کے بعد کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی بنیں گے، بے شک یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے ایک پیغام ہیں جو عبادت گذار ہیں)

جو لوگ دعوت الی اللہ کے راستہ میں مصیبتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرتے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ خوش خبری سنائی کہ جو اہل دین ہیں، اور

مختلف قسم کی مشکلات و پریشانیوں میں ہیں، ہر طرف سے ان پر طنز و تعریض ہوتا ہے، ان کو سہولتیں حاصل نہیں ہیں، جیسا کہ اہل دین کے ساتھ ہوتا رہا ہے، ہر کوئی جانتا ہے کہ جو اللہ کی رضا پر اپنی زندگی کو لگائے ہوئے ہیں، ان کو کیسی مشکلات پیش آتی ہیں، مذکورہ آیت میں انہیں کے متعلق فرمایا گیا کہ ہم نے یہ بات زبور میں بھی لکھ دی ہے، زبور جو کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اس میں دین کی باتوں کے تذکرہ کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ وہی لوگ اس زمین کے وارث بنیں گے، جو میرے اچھے اور نیک بندے ہیں، یہ اشارہ اس بات کی طرف بھی ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف لانے کے بعد جو فتوحات حاصل ہوئیں، اور اسلام اور اہل دین کو سربلندی حاصل ہوئی، گویا کہ یہ ایک نئی چیز تھی، کیونکہ عام طور پر اہل دین کو ایسی سربلندی حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اہل دنیا کو ہوتی ہے، لیکن جب اسلام آیا تو زمین کے ایک بڑے حصہ پر ان لوگوں کی حکومت قائم ہوگئی، جو بڑے متقی و پرہیزگار اور دین پر عمل کرنے والے تھے، چنانچہ ممکن ہے کہ اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ ہم نے زبور ہی میں یہ بات لکھ دی تھی کہ ایسا وقت آئے گا کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے، یہ بات امت مسلمہ کی طرف ہی اشارہ کر رہی ہو، اس کے علاوہ یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ اخیر میں یعنی جب حالات بہت زیادہ خراب ہوجائیں گے، تو امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے، اس وقت پھر دوبارہ باطل کو بالکل شکست ہوجائے گی، باطل مٹادیا جائے گا اور خالص اللہ والی حکومت قائم ہوجائے گی، گویا اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ ایسا دور آئے گا، لہٰذا تم یہ نہ سمجھو کہ اہل دین کے لیے یہی مقرر ہے کہ وہ ہمیشہ پریشانی میں رہیں گے، بلکہ ایک دور ایسا آئے گا جب نیک اور اچھے لوگ ہی غالب ہوں گے، اور اس دنیا کے حقیقی وارث ہوں گے۔

متقین کے لیے پیغام

اس پیشین گوئی کے بعد فرمایا کہ یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے پیغام ہیں جو اللہ

www.abulhasanalinadw.org

کے نیک بندے ہیں، اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں، جو اللہ کو مانتے ہیں، گویا ان کی اطلاع کے لیے ہماری طرف سے یہ ایک پیغام ہے، تا کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کر سکتا ہے، اس نے انسان کے امتحان کے لیے اختیار دے دیا تھا، اسی لیے انسان برائیوں میں اتنا مبتلا ہو گیا، ورنہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو نیک بنا دیتا، سب کی ایسی فطرت بنا دیتا کہ وہ برا کر ہی نہیں سکتے تھے، جیسے اور ساری مخلوقات ہیں، ان کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس کی نافرمانی کر سکیں، بلکہ وہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی رہتی ہیں اور اسی کو یاد کرتی ہیں، خود قرآن مجید میں آتا ہے کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اللہ کی تسبیح بیان نہ کرتی ہو، لیکن تمام مخلوقات سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اس کو ایک محدود دائرہ میں اختیار حاصل ہے، حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسان کو بھی ایسا بنا سکتا تھا کہ عبادت اس کے مزاج میں داخل ہو جاتی۔

رسول رحمت ﷺ

﴿وَمَا أَرۡسَلۡنَاكَ إِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعَالَمِينَ﴾ (الأنبياء: ١٠٧)

(اور ہم نے آپ کو سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو خطاب کر کے ساری انسانیت کو بتا دیا گیا کہ آپ ﷺ کو ہم نے خاص طور پر سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، یعنی آپ کی وجہ سے ساری انسانیت کو فائدہ پہنچ رہا ہے، جو مسلمان ہو گئے ہیں ان کو اس طرح کہ وہ اللہ والے ہو گئے، اور جو نہیں ہوئے ان کو بھی اس طرح پہنچ رہا ہے کہ زندگی گذارنے کا قرینہ ان کو حاصل ہو گیا ہے، اس لیے کہ یہ دین جامع ہے، اور پوری انسانی زندگی پر محیط ہے، اس میں زندگی کے سارے شعبے اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے، ورنہ اور ادیان میں عبادت تک بات ختم ہو جاتی ہے، ان میں عبادت کے بعد جو چاہو کرو، زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے سلسلہ میں ان کے یہاں کوئی رہنمائی نہیں ہے، انسان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ تم اپنی عقل سے مسئلہ حل کر لو، لیکن ہدایات

www.abulhasanalinadw.org

نہیں ہیں، اگر کسی کو ان ہدایات سے مستفید ہونا ہے تو وہ صرف مذہب اسلام میں ہیں، اس میں زندگی کے ہر شعبے کے لیے ہدایات ہیں، اور صرف ہدایات ہی نہیں ہیں، بلکہ ان ہدایات پر عمل بھی ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں معاشرہ ترقی کرتا ہے، اور اگر اس میں کوئی سستی ہوتی ہے تو اللہ کا نظام یہ ہے کہ اس امت میں ہر دور میں اتنے افراد اور اتنے صلحاء گذرتے رہے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ اسی لیے ہوا ہے تاکہ انسانی حالات اچھے رہیں اور معاشرہ ترقی کی اعلیٰ مثال بن سکے۔

دین اسلام کا یہ وہ فطری نظام ہے جس کو دیکھ کر غیر مسلموں کو غیر معمولی فائدہ پہنچا ہے، گویا اگر اس زمین پر مسلمان نہ ہوتے تو غیر مسلموں کی حالت اور زیادہ بدتر ہوتی، یہ بات بغیر کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ ان میں بہت سی اچھائیاں مسلمانوں کی صحبت ہی سے آگئی ہیں، وہ اسلام تو نہ لائے لیکن اسلامی تعلیمات سے متاثر ضرور ہوئے۔

اسلام آنے سے قبل خود ہمارے ملک کا حال یہ تھا کہ یہاں کے لوگ ننگے رہتے تھے، وہ ایک چادر لپیٹ لیتے اور کپڑا لپیٹ لیتے، اور تقشّف و رہبانیت میں لگے رہتے تھے، اپنی زندگی جانوروں کی طرح گذارتے تھے، ان کے یہاں کھانے کا بھی کوئی سلیقہ نہ تھا، اسی لیے جب اسلامی تہذیب کو انہوں نے دیکھا تو انہوں نے بہت سی باتیں مسلمانوں سے سیکھیں، جس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی بے تحاشہ فائدہ پہنچایا ہے۔

یورپ کی حالت پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ جب اسلام آیا اس وقت اس کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی، وہاں علم کو جرم سمجھا جاتا تھا، کوئی تعلیم حاصل نہیں کرسکتا تھا، حصول علم پر باقاعدہ سزا ہوتی تھی، اس لیے کہ ان کے جو پادری ہوتے تھے ان کا تسلط تھا، بادشاہ بھی ان کی بات ماننے پر مجبور تھا، اگر کوئی علم کی بات کرتا تو اس کی سزا ہوتی تھی، کئی لوگوں کو اسی بات پر پھانسی دی گئی، اسی طرح ان کے یہاں علاج کا بھی کوئی نظم نہ تھا، جادو ٹوٹکے اور عملیات ہی سے وہ علاج کرتے تھے، دواؤں کا ان کے یہاں کوئی تصور نہ تھا، بالکل جانوروں والی زندگی تھی، لیکن مسلمانوں نے ان میں علم کا شعور پیدا

کیا، جس کو متفقہ طور پر سب ہی مانتے ہیں اور وہ تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئے۔

غرض کہ اسلام کے آنے سے اور حضور ﷺ کے امتیوں سے ساری دنیا کو فائدہ پہنچا، اس وقت ہم اور آپ دنیا میں جو خیر دیکھ رہے ہیں، یہ مسلمانوں اور اسلام ہی کی برکت ہے، اگرچہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ یورپ کی دین ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے خود سب کچھ مسلمانوں ہی سے سیکھا، صحبت سے غیر معمولی اثر پڑتا ہے، اگر آپ نیک آدمی کی صحبت میں رہیں گے تو آپ اس کی نیکیاں سیکھ لیں گے، اور برے آدمی کی صحبت میں رہیں گے تو برائیاں سیکھ لیں گے، تو مسلمانوں کی صحبت اور ان کے اثر سے جو غیر مسلموں کو فائدہ پہنچا، اس کی وجہ سے ان میں تہذیب آگئی، اس سے پہلے وہ شائستہ نہ تھے، وہ جانوروں والی زندگی گذارتے تھے، علم کو برا سمجھتے تھے، لیکن اسلام کے بعد ان کے تمام نظریے بدل گئے۔

معلوم ہوا حضور ﷺ کی آمد ساری کائنات اور سارے عالموں کے لیے رحمت کا ذریعہ بنی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ایک مرتبہ اسی موضوع کو اپنی سیرت کی ایک تقریر میں بیان کر رہے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر میں ایک پرلطف کیفیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ حضور ﷺ کی رحمت کا نتیجہ ہے کہ آج یہ لاؤڈ اسپیکر ہمارے سامنے ہے، جس سے ہم آواز کو تیز کر سکتے ہیں، اگر حضور ﷺ کی تعلیمات نہ آئی ہوتیں، اور مسلمانوں کی تہذیب اور ان کی شائستگی اور دین داری لوگوں کے سامنے نہ آتی تو دنیا ترقی کی ان منازل سے کبھی بھی ہم کنار نہ ہوتی۔

مسلمانوں کا جو علم سے تعلق رہا ہے وہ غیر معمولی ہے، موجودہ دور میں جو غیروں کے یہاں علم کی رمق نظر آتی ہے، یہ سب غیروں نے مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے خواہ وہ نہ مانیں، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے پاس کچھ نہ تھا، جب علم ہی نہیں تھا تو کیا تھا، اب جو ساری ایجادات آرہی ہیں، گرچہ کہنے کو ان کی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو شعور کہاں سے پیدا ہوا، لامحالہ اس کا جواب یہی ہوگا کہ یہ شعور مسلمانوں ہی سے ان میں آیا، علم کی طرف توجہ کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ یہ سب انہوں نے

www.abulhasanalinadw.org

مسلمانوں ہی سے سیکھا اور اس میں ترقی کرتے چلے گئے، اور مسلمان اس میں غفلت کرنے لگے تو پیچھے چلے گئے، لیکن سیکھا انہوں نے مسلمانوں سے ہی ہے، غرض کہ اس وقت جو کچھ بھی ہم اور آپ اس دنیا میں اچھی بات یا اچھا نظام دیکھ رہے ہیں، یہ اکثر وہ ہے جو حضور ﷺ کی بعثت کا نتیجہ ہے، اور مذکورہ آیت میں انہیں تمام حقائق کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، یہ کوئی معمولی جملہ نہیں ہے، اس کو یوں سمجھیں کہ آپ ﷺ کی بعثت سے پوری دنیا سنبھل گئی، اس میں معقولیت آ گئی، دنیا کے لوگ جانور بنے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے ان کو انسان بنادیا، بس یہ ایک کسر رہ گئی کہ وہ مسلمان بھی ہوجاتے، شریعت پر پوری طرح عمل کرنے لگتے، لیکن ایسا انہوں نے اپنی ضد میں نہ کیا، البتہ شائستگی اور معقولیت اور خیر کی تمام چیزوں کو مسلمانوں ہی سے حاصل کیا۔

خدائے واحد و برتر

﴿قُلْ إِنَّمَا يُوحَى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ☆فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ عَلَى سَوَاء وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ☆إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ☆وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ☆قَالَ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا الرَّحْمَنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ﴾ (الأنبياء: ١٠٨-١١٢)

(آپ کہہ دیجئے کہ مجھے یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، تو کیا تم تسلیم کرتے ہو، لیکن اگر وہ بھاگیں تو کہہ دیجیے تم سب کو برابر میں نے آگاہ کردیا البتہ میں یہ نہیں جانتا کہ یہ موقع جلدی آئے گا یا دیر میں، بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری ہر ڈھکی چھپی بات سے واقف ہے، اور میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ تمہیں کس چیز میں اللہ تعالیٰ نے

www.abulhasanalinadw.org

آزمائش میں ڈالا ہے اور کس چیز میں تم کو وقتی طور پر فائدہ عطا فرمایا ہے، انہوں نے کہا؛ اے میرے پروردگار! جو حق بات ہے اس کا فیصلہ فرمادے اور ہمارا رب رحمان ہے اسی سے ہم مدد چاہتے ہیں، ان باتوں پر جو تم اپنے منہ سے کہتے ہو)

مذکورہ آیات میں نبی کی بات کی اہمیت بتاتے ہوئے فرمایا کہ اے نبی ﷺ! یہ کہہ دیجئے کہ میں جو کچھ تم کو بتارہا ہوں، تم سے کہہ رہا ہوں، وہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں، وہ کوئی انسانی بات نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ آپ یہ اعتراض کریں کہ تم میں اور ہم میں کیا فرق ہے، ہم بھی اتنی ہی عقل رکھتے ہیں جیسی آپ رکھتے ہیں، جیسے آپ انسان ہیں، ویسے ہی ہم بھی انسان ہیں، تو آپ کی بات ہماری بات سے کیسے بہتر ہوسکتی ہے، ہم کوئی بے وقوف نہیں ہیں، ہم بھی خوب سمجھتے ہیں، اسی لیے تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ آپ یہ کہہ دیجئے کہ ہماری بات صرف انسانی بات نہیں ہے، بلکہ یہ اوپر سے آئی ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بات ہے جو ہم پہنچا رہے ہیں، لہٰذا تم اس کو ایسے نہ سنو جیسے انسان کی بات سنتے ہو، اگر تم انسان سمجھ کر ہماری بات سنو گے تو یقیناً یہی سوچو گے کہ ہماری اور ان کی سوچ میں کیا فرق ہوسکتا ہے، اسی لیے وضاحت سے فرمادیا گیا کہ یہ جو کچھ بھی ہم کہہ رہے ہیں، یہ حقیقت میں ہمارے پاس اوپر سے بھیجا گیا ہے، اور ہمارے کہنے میں پہلی بات یہ ہے کہ ساری مخلوق کا ایک ہی خدا ہے، ہماری تمام باتوں کی یہی پہلی بات بنیاد ہے، اسی پر ساری عمارت کھڑی ہے، کیونکہ جب تم خدا کو مانو گے کہ ایک ہی خدا ہے، تو تمہیں ایک ہی خدا کی پرستش بھی کرنی ہوگی، پھر اس کا جو پیغام ہے اس کو بھی ماننا پڑے گا، لیکن اگر تم متعدد خدا بناؤ گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی اس کے پیچھے جارہا ہے کوئی اس کے پیچھے جارہا ہے، اور اس طرح تمام انسان بٹ جائیں گے، اس حقیقت کو پیش کرنے کے بعد سوالیہ انداز میں یہ معلوم کیا گیا کہ کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو اور کیا تم اس بات پر اسلام لاتے ہو۔

www.abulhasanalinadw.org

اس کے بعد اسی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ دوٹوک انداز میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اگر یہ لوگ بھاگیں گے، اور آپ کی بات سننے کو تیار نہ ہوں گے تو آپ کہہ دیجئے کہ ابھی ہم پوری طرح بات کو پھیلا کر تمہیں اطلاع دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تم پر گرفت ہوگی، البتہ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس کا موقع جلدی آئے گا یا دیر میں آئے گا، لیکن یہ ضرور تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے کہ نافرمانوں کو جہنم میں جانا ہوگا، اور فرماں بردار جنت میں جائیں گے۔

اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کو بتاتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ زور والی بات اور جو بات چھپا کر کی جاتی ہے سب جانتا ہے، تم جو کچھ کرتے ہو یا کرو گے وہ اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہے، لہٰذا یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ جو تم کھل کر ظاہر کر کے کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کو وہی معلوم ہے، بلکہ اس کو وہ بھی معلوم ہے جو تم چھپاتے ہو۔

اخیر آیت میں اہل ایمان کو نبی ﷺ کی زبانی یہ دعوت دی گئی کہ وہ ہر طرح کے حالات میں اپنے پروردگار کے حضور دعا گو رہیں، فرمایا گیا کہ نبی ﷺ نے کہا کہ اے پروردگار! جو بات حق ہے اس کا فیصلہ فرما دے اور اس کا حکم فرما دے، ہمارا رب تو وہ رحمان ہی ہے، اسی سے ہم مدد چاہتے ہیں، ان باتوں پر جو تم انکاری لوگ اپنے منھ سے کہتے ہو، اور تم جو طرح طرح کی باتیں دین کے خلاف بیان کرتے ہو، اس میں ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہم اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہتے ہیں کہ وہ ان باتوں کا حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے۔